مارچ ۱۹۹۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

- عظمتِ صیام و قیامِ رمضان
- فتنۂ دجّال

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے خطابات سے ماخو

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلا

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

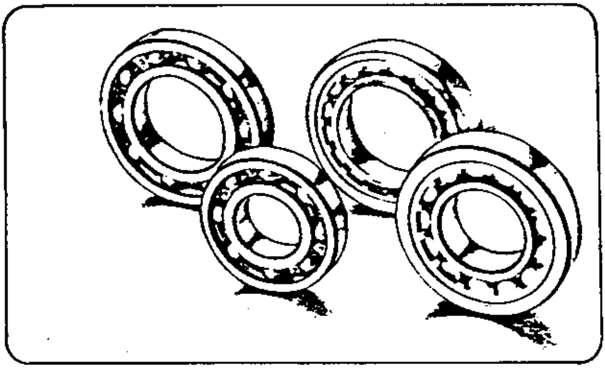

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : **(Opening Shortly)**
Amin Arcade 42,
Brandreth Road, Lahore-54000
Ph : 54169

GUJRANWALA :
1-Haider Shopping Centre, Circular Road,
Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اُوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۲
شمارہ: ۳
رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ
مارچ ۱۹۹۳ء
فی شمارہ -/۵
سالانہ زرتعاون -/۵۰

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، مسقط، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات۔	۳۰ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا۔	۶۔ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ۔	۱۱۔ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۱۴۔ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

یکے از مطبوعات تنظیم اسلامی، مرکزی دفتر: ۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور

پبلشر: لطف الرحمٰن خان، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

☆ عرضِ احوال ——— ۳

☆ عظمتِ صیام و قیامِ رمضان ——— ۵
امیر تنظیم اسلامی کے ایک فکر انگیز خطاب کی تلخیص

☆ سیرتِ نبویؐ: انقلابی عمل کے فہم کا واحد ذریعہ ——— ۲۳
بسلسلہ منہجِ انقلابِ نبویؐ
ڈاکٹر اسرار احمد

☆ فتنۂ دجال ——— ۳۱
امیر تنظیم اسلامی کے خطابات سے ماخوذ
مرتب: راشد حفیظ

☆ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خطبۂ خلافت ——— ۳۹
نظری اور عملی سیاست کا منشور
محمد شکیل صدیقی

☆ قندِ مکرر ——— ۴۹
مدح عمرؓ بزبان صدیق اکبرؓ
قاضی محمد حمید فضلی

☆ کتابیات ——— ۵۴
بارہواں کبیرہ: ترکِ نماز
ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

☆ حسنِ انتخاب ——— ۶۵
عزیمتِ دعوت
مولانا ابوالکلام آزاد کے 'تذکرہ' سے ماخوذ
تلخیص و تدوین: ڈاکٹر محمد عثمان

☆ رفقاء کی ذمہ داریاں ——— ۷۴
نجیب صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

میثاق کا زیرِ نظر شمارہ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچنے تک نصف رمضان المبارک گذر چکا ہوگا۔ رمضان اور قرآن کا جو باہمی تعلق ہے رفقاء تنظیم اسلامی اور قارئین میثاق اس سے بخوبی آگاہ ہوں گے۔ ماہ رمضان نزولِ قرآن کا مہینہ ہے۔ اس ماہ مبارک میں دن کا روزہ فرض قرار دیا گیا ہے تو راتوں کے قیام کے لئے بہت زیادہ ترغیب و تشویق دلائی گئی ہے۔ چنانچہ احادیثِ مبارکہ میں دن کو روزہ رکھنے اور رات کو قرآن کے ساتھ قیام کرنے کا ذکر بالکل ہم وزن اور متوازی و مساوی انداز میں آیا ہے۔ تنظیم اسلامی کے رفقاء اس اعتبار سے بہت خوش قسمت ہیں کہ وہ ایک ایسی جماعت سے وابستہ ہیں جس کی دعوت کی بنیاد ہی قرآن کا انقلابی فکر ہے' اور بحمد اللہ دروس قرآن کے حلقوں اور بالخصوص رمضان المبارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگراموں کے ذریعے قرآن کے سیکھنے سکھانے' سمجھنے سمجھانے اور قرآن کی دعوت کو عام کرنے کو اس تنظیم اور اس کے امیر کی پہچان کی حیثیت حاصل ہے۔

اس بار ماہ رمضان المبارک میں امیر محترم کی ہدایت پر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی طرف سے رجوع الی القرآن کی دعوت کو وسعت دینے کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا گیا ہے' جس کا خاکہ کچھ اس طرح ہے کہ اخبارات میں اشتہارات دے کر لوگوں کو قرآن فہمی کی ضرورت کا احساس دلایا جائے اور انہیں اس فریضے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ پھر جو لوگ اس منصوبے کی تفصیلات طلب کریں انہیں انجمن/تنظیم کی لائبریریوں کی رکنیت اختیار کرنے' کتب و کیسٹ خریدنے' درس قرآن کے کسی قریبی حلقے میں شامل ہونے' قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی اور ابتدائی عربی گرامر پر مبنی خط و کتابت کورسز میں شمولیت اختیار کرنے یا دینی تعلیم کے ایک سالہ کورس میں داخلہ لینے کی دعوت دی جائے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل گوشوارے کے مطابق اخبارات میں اشتہارات شائع کرائے گئے ہیں:

۱۔ روزنامہ پاکستان (کُل پاکستان ایڈیشن) بروز جمعہ مورخہ ۱۹/ فروری ۹۳ء
۲۔ روزنامہ نوائے وقت (کل پاکستان ایڈیشن) بروز جمعہ مورخہ ۲۶/ فروری ۹۳ء
۳۔ روزنامہ جنگ (کل پاکستان ایڈیشن) بروز جمعہ مورخہ ۵/ مارچ ۹۳ء

ان اشتہارات کی افادیت کو دیکھتے ہوئے اگر ضرورت محسوس ہوئی تو رمضان المبارک کے آخری عشرے میں دوبارہ اشتہارات شائع کرائے جائیں گے ــــ رفقاء تنظیم اسلامی اور قارئین میثاق سے ہماری درخواست ہے کہ مذکورہ بالا تاریخوں کے معین اخبارات میں اشتہار کا مطالعہ کرلیں اور پھر اپنے حلقۂ اثر میں اس کا تذکرہ کریں تاکہ جن لوگوں کی نظر سے وہ اشتہار نہیں گذرا ان کو بھی اس کا علم ہوجائے۔ نیز جو لوگ اس پروگرام میں دلچسپی ظاہر کریں ان کے نام اور پتے "خط و کتابت کورس' ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور" کے ایڈریس پر از خود ارسال کردیں تاکہ خط لکھنے کی سستی کی وجہ سے کوئی خواہشمند اس میں شرکت سے محروم نہ رہے۔ کیا عجب کہ آپ کا کسی شخص کو قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات کی جانب متوجہ کرنا آپ کے لئے نعمتِ عظمٰی ثابت ہو!

☆ ☆ ☆

روزے اور قرآن کے باہمی تعلق کے حوالے سے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کی جس تحریک کی ابتدا آج سے نو سال قبل کی تھی وہ بحمد اللہ بتدریج وسعت پذیر ہے اور اس کے ذریعے ہر سال کثیر تعداد میں مرد و زن قرآن حکیم کے ترجمہ و تفہیم سے مستفید ہوتے ہیں۔ جامع القرآن قرآن اکیڈمی میں' جہاں سے اس مبارک کام کا آغاز ہوا تھا' یہ روایت ہر سال باقاعدگی سے نبھائی جاتی ہے اور امسال بھی حافظ عاکف سعید صاحب اپنے مؤثر اور شگفتہ انداز میں دورۂ ترجمۂ قرآن کروا رہے ہیں۔ لاہور میں اس کے علاوہ مزید پانچ مقامات پر دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگرام ہو رہے ہیں' جن میں سے دو مقامات پر فتح محمد قریشی صاحب اور چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب ترجمہ قرآن بیان کررہے ہیں' جبکہ تین مقامات پر ویڈیو کیسٹ کے ذریعے محترم ڈاکٹر صاحب کے دورۂ ترجمہ قرآن سے استفادہ کیا جارہا ہے۔ مزید برآں فیروز والا (مضافات لاہور) میں نعیم اختر عدنان صاحب ' فیصل آباد میں ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب' ملتان میں مختار حسین فاروقی صاحب اور کراچی میں نوید احمد صاحب دورۂ ترجمۂ قرآن کی ذمہ داری نبھارہے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس محنت کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور "رجوع الی القرآن" کی اس تحریک میں مزید برکت و وسعت پیدا فرمائے (آمین)

عظمتِ صیام و قیامِ رمضان

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے ایک فکر انگیز خطاب کی تلخیص

رمضان المبارک کی برکات سے مستفید ہونے اور اس ماہِ مبارک کے استقبال کے لئے ذہنی تیاری کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خطبے کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

چشمِ تصور سے دیکھئے کہ آج سے چودہ سو برس قبل مسجد نبویؐ میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جمع ہیں اور ان کے سامنے رمضان المبارک کے بیان کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ خطبہ ارشاد فرمارہے ہیں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ماہِ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک خطبہ دیا' اس میں ارشاد فرمایا: "اے لوگو! تم پر ایک عظمت والا مہینہ سایہ فگن ہورہا ہے"... گویا رمضان کا سایہ شعبان کی آخری تاریخ سے پڑنا شروع ہوجاتا ہے۔ "یہ مہینہ بڑا بابرکت ہے۔ اس (مبارک) مہینہ میں ایک رات (شبِ قدر) ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے"۔.... حدیث شریف کے اس ٹکڑے میں قرآن مجید کی سورۃ القدر کی طرف اشارہ ہوگیا: "ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔ اور (اے نبی!) آپ کیا سمجھے کہ شبِ قدر کیا چیز ہے! (یہ) شبِ قدر (خیرو برکت میں) ہزار مہینوں سے بہتر ہے"۔۔۔ خطبہ میں حضورؐ نے آگے ارشاد فرمایا: "اللہ نے اس مہینہ کا روزہ رکھنا فرض ٹھہرایا ہے اور اس کی رات میں قیام کرنے (یعنی تراویح) کو نفل قرار دیا ہے"... اس بات کو میں آگے چل کر وضاحت سے بیان کروں گا کہ نماز تراویح کی کیا اہمیت ہے' اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے' اور پھر یہ کہ رمضان المبارک کی راتوں کے قیام کی اصل روح کیا ہے! اس کا قرآن مجید کے ساتھ ربط و تعلق اور اس کی عظیم ترین افادیت کیا ہے!! البتہ اس وقت یہ نوٹ کرلیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ میں الفاظ ہیں جَعَلَ اللّٰہُ

صِيَامَهٗ فَرِيضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا— ظاہر بات ہے کہ قیام اللیل تو ہر شب میں نفل ہے اور اس کی بڑی فضیلت ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظِ مبارکہ سے صاف متبادر ہوتا ہے کہ رمضان المبارک میں قیام اللیل کی خصوصی اہمیت و فضیلت ہے۔ اگرچہ فرضیت نہیں ہے' لیکن اللہ کی طرف سے اس کا تطوع اور اس کی مجعولیت ثابت ہے' کیونکہ دونوں کے ساتھ فعل "جَعَلَ اللّٰہ " آیا ہے... آگے فرمایا: "جو کوئی بھی اس مہینہ میں نیکی کا کوئی کام کرکے اللہ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرنا چاہے گا تو اسے اس کا اجر و ثواب اتنا ملے گا جیسے دوسرے دنوں میں کسی فرض کے ادا کرنے پر ملے گا"—— یعنی مسنون و نفلی نیکی اس ماہ مبارک میں اجر و ثواب کے اعتبار سے عام دنوں کی فرض عبادات کی ادائیگی کے مساوی ہوجائے گی... "اور جو کوئی اس مہینہ میں فرض ادا کرتا ہے تو اس کو دوسرے زمانہ کے ستر فرض ادا کرنے کے برابر ثواب ملے گا"... گویا اگر ہم اس ماہ مبارک میں ایک فرض نماز ادا کرتے ہیں تو غیر رمضان کی ادا کردہ ستر فرض نمازیں ادا کرنے کے برابر ثواب پانے کے مستحق ہوجاتے ہیں.... آگے فرمایا: "اور یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا اجر و ثواب جنت ہے"—— اس مہینہ میں ایک بندۂ مومن بھوک پیاس برداشت کرتا ہے' جائز طریقہ سے اپنے جنسی جذبہ کی تسکین سے بھی اجتناب کرتا ہے' لوگوں کی کڑوی کسیلی اور ناخوشگوار باتوں پر خاموشی اختیار کرتا ہے' غیبت و زُور سے بچتا ہے۔ یہ تمام کام اور اسی نوع کے نواہی سے بچنا سب صبر کے مفہوم میں شامل ہیں' اور اس صبر کا بدلہ جنت ہے۔ حدیث شریف کا یہ ٹکڑا جہاں اہلِ ایمان کے لئے بشارت لئے ہوئے ہے وہاں یہ فصاحت و بلاغت کا بھی ایک عظیم مرقع ہے.... آگے فرمایا: "اور یہ آپس کی ہمدردی اور دمسازی کا مہینہ ہے"... اس لئے کہ جس کسی کو کبھی بھوک پیاس کا تجربہ نہیں ہوتا تو اسے اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ کسی بھوکے پیاسے انسان پر کیا بیتتی ہے۔ اس مہینہ میں اسے بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ بھوک کسے کہتے ہیں اور پیاس کیا ہوتی ہے! اس طرح یقیناً دل میں انسانی ہمدردی کا ایک جذبہ بیدار ہوتا ہے.... آگے فرمایا: "اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن کے رزق میں اضافہ ہوتا ہے" یعنی اس میں برکت ہوتی ہے۔ آگے ارشاد ہوا: "جو کوئی اس مہینہ میں کسی روزہ دار کا روزہ (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لئے) افطار کرائے گا' اس کے لئے اس کے گناہوں کی مغفرت

بھی ہوگی اور اس کی گردن کا آتشِ دوزخ سے چھٹکارا پالینا بھی ہوگا۔ اور اسے اس روزہ دار کے برابر اجر و ثواب بھی ملے گا' بغیر اس کے کہ اس (افطار کرنے والے روزے دار) کے اجر میں سے کوئی بھی کمی کی جائے"... آپ حضرات کو معلوم ہوگا کہ حضرت سلمان فارسیؓ ان فقراء صحابہ کرامؓ میں سے تھے جن کے پاس اموال و اسباب دنیوی نہ ہونے کے برابر تھے اور جن پر عام دنوں میں بھی فاقے پڑتے تھے۔ ان اصحابؓ کو اتنی مقدرت کہاں حاصل تھی کہ وہ کسی روزہ دار کو افطار کراسکتے۔ چنانچہ اسی حدیث شریف میں آگے آتا ہے کہ "ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم میں سے ہر ایک کو تو روزہ دار کا روزہ افطار کرانے کی استطاعت نہیں ہے (تو کیا ہم اس اجر و ثواب سے محروم رہیں گے؟" اس پر حضورؐ نے جو جواب ارشاد فرمایا اسے حضرت سلمان فارسیؓ آگے بیان کرتے ہیں: تو رسول اللہؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: "یہ ثواب اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی عطا فرمائے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی پر یا صرف پانی کے ایک گھونٹ ہی پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرائے گا"..... یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ ہمارے یہاں اس دور میں کھانے پینے کی اشیاء کی جو افراط ہے اس وقت اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت اگر فقراء صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو افطار کے لئے کہیں سے کچھ دودھ مل جاتا تھا تو وہ اس میں پانی ملا کر لسی بنا لیا کرتے تھے اور کوئی رفیق ایسا بھی ہو جسے یہ بھی میسر نہیں تو اگر وہ اسے اس لسی میں شریک کرلے تو اس وقت کے حالات میں یہ بھی بہت بڑا ایثار تھا۔
آگے چلئے' حضورؐ کے ارشاد کا سلسلہ جاری ہے: "اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے گا اسے اللہ تعالیٰ میرے حوض یعنی (حوضِ کوثر) سے ایسا سیراب فرمائے گا کہ (میدانِ حشر کے مرحلہ سے لے کر بقیہ تمام مراحل میں) اس کو پیاس ہی نہیں لگے گی تا آنکہ وہ جنت میں داخل ہوجائے گا"۔ مزید فرمایا: "اور یہ مہینہ وہ ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ یعنی پہلا عشرہ اللہ کی رحمت کا ظہور ہے' اس کا درمیانی حصہ یعنی دوسرا عشرہ مغفرت خداوندی کا مظہر ہے اور اس کا آخری حصہ یعنی تیسرا عشرہ تو گردنوں کو آتشِ دوزخ سے چھڑا لینے کی بشارت اور نوید سے معمور ہے۔ اور جو کوئی اس مہینہ میں غلام و خادم اور زیر دستوں کی مشقت میں تخفیف اور کمی کردے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اسے آتشِ دوزخ سے آزادی کا پروانہ عطا فرمائے گا"۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت کردہ اس حدیث شریف کی رو سے یہ وہ خطبۂ مبارکہ ہے جو نبی اکرمؐ نے شعبان کی آخری تاریخ کو ارشاد فرمایا۔ اس سے آپ حضرات کو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے کس طرح یہ چاہا کہ لوگ اس عظمت والے اور برکت والے مہینہ سے مستفیض و مستفید ہونے کے لئے ذہناً تیار ہو جائیں۔ اس لئے کہ جب تک کسی شخص کو کسی چیز کی حقیقی قدر و قیمت کا شعور نہ ہو' اس وقت تک انسان اس سے صحیح طور پر اور بھرپور استفادہ کر ہی نہیں سکتا۔

اب آیئے سورۃ البقرہ کے تیئسویں (۲۳) رکوع کی طرف جو چھ آیات پر مشتمل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ ان آیاتِ مبارکہ کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ سب سے پہلی بات یہ سمجھ لیجئے کہ روزے کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ ہے کہ اس سے متعلقہ مضامین' تمام احکام اور اس کی ساری حکمتیں قرآن مجید میں اس مقام پر یکجا ہو کر آگئی ہیں۔ آپ کے علم میں ہے کہ نماز جو ارکانِ اسلام کی رکنِ رکین ہے' جسے حضورؐ نے "**عِمادُ الدِّین**" اور "**قُرَّۃُ عینی**" فرمایا ہے' اس کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ کسی ایک ہی مقام پر نماز سے متعلق تمام تفصیلی احکام بیان کردیئے گئے ہوں۔ آپ کو نماز کا ذکر قرآن مجید میں متفرق مقامات پر منتشر ملے گا۔ پھر صلوٰۃ کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر آپ کو قرآن مجید میں کثرت سے مختلف مقامات پر نظر آئے گا۔ لیکن زکوٰۃ کے نصاب' مقادیر کا تعین اور ادائیگی کی مدت کا ذکر پورے قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے۔ اس کے جملہ تفصیلی احکام ہمیں سنت و حدیث شریف میں ملتے ہیں۔ اسی طرح سے حج کا معاملہ ہے۔ لیکن صوم یعنی روزے کا معاملہ یہ ہے کہ اگر کوئی ہمت کر کے ان چھ آیات کو سمجھ لے تو گویا ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن یعنی صوم کے بارے میں جو کچھ قرآن حکیم میں آیا ہے' اس کا علم اسے حاصل ہو جائے گا۔ ان آیات پر براہِ راست گفتگو سے قبل ابتداء ہی میں یہ بات بھی جان لیجئے کہ یہ ایک اعتبار سے مقام مشکلات القرآن میں سے ہے اور اس کے ضمن میں مختلف تفسیری آراء ہیں۔ ان میں سے جس رائے پر میرا دل ٹھکا ہے وہ سلف میں بھی موجود ہے اور خلف میں بھی' لیکن متداولہ اردو تفاسیر میں چونکہ عام طور پر اس کا ذکر نہیں ہے' لہٰذا وہ رائے بالعموم نگاہوں سے اوجھل ہے۔ وہی بات اس وقت میں آپ کے سامنے رکھوں گا' لیکن اس کے لئے تمام دلائل دینا اس وقت ممکن نہیں

ہوگا کیونکہ اس وقت ان آیات کا مفصل درس پیشِ نظر نہیں ہے۔ وہ رائے یہ ہے کہ اس رکوع کی پہلی دو آیات رمضان کے روزے سے متعلق نہیں بلکہ ایامِ بیض کے روزوں سے متعلق ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو ابتداء میں آپؐ نے مسلمانوں کو ہر مہینے میں ایامِ بیض کے تین روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ ایامِ بیض سے مراد ہیں روشن راتوں والے دن' یعنی چاند کی تیرھویں' چودھویں اور پندرھویں راتوں سے ملحق دن۔ ان تین دنوں کے روزوں سے متعلق ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم کے طور پر ان دو آیات میں آگئی۔ یہ ایک رائے ہے اور میں اسے ہی بیان کررہا ہوں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کے علاوہ دوسری آراء بھی ہیں' لیکن میرا دل اسی پر مطمئن ہوا ہے۔

ان تین دنوں کے روزوں میں جن کی ہدایت نبی اکرمؐ نے دی تھی چند رعایتیں بھی رکھی گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اگر ان تین دنوں میں تم بیمار ہو تو ان کی بجائے کوئی سے اور تین دنوں میں روزہ رکھ لو۔ اگر تم سفر پر ہو تو بعد میں ان کی قضا ادا کرسکتے ہو۔ ایک رعایت مزید تھی۔ اور اس کا تعلق اسلام کی حکمتِ تشریعی سے ہے کہ لوگوں کو تدریجاً خوگر بنایا گیا ہے اور چونکہ اہلِ عرب روزے سے واقف ہی نہیں تھے' صوم کی عبادت ان کے لئے غیرمانوس تھی اور حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کر کے وہ جن روایات کی پابندی کرتے تھے اور جسے وہ دینِ حنیف کہتے تھے' اس میں روزہ موجود نہیں تھا' لہٰذا روزہ کی عبادت سے مانوس کرنے کے لئے ابتداء میں یہ رعایت بھی رکھی گئی کہ اگر تم صحت مند ہونے کے باوجود اور مقیم ہونے کے باوصف روزہ نہ رکھو تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دو' یہ اس کا فدیہ بن جائے گا۔ اس کے بعد جب رمضان کے روزے والی آیت (آیت نمبر ۱۸۵) نازل ہوئی تو پہلی دو رعایتیں تو علیٰ حالہ برقرار رہیں کہ اگر کبھی بیمار ہو یا مسافر ہو تو قضا کرسکتے ہو' تعداد بعد میں پوری کرلو... لیکن وہ جو تیسری مزید رعایت فدیہ ادا کرنے کی تھی وہ ساقط ہوگئی۔ لہٰذا ارشاد ہوا: "اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جیسے کہ یہ فرض کیا گیا تھا ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے"—— چونکہ عرب کے لوگ روزے کے عادی نہیں تھے تو پہلی بات سمجھانے کے انداز میں یہ فرمائی گئی کہ یہ کوئی نیا حکم نہیں ہے جو تمہیں دیا جارہا ہے بلکہ یہ حکم پہلی امتوں کو بھی مل چکا ہے۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا

یہ فرمانا فرضیت کے لحاظ سے ہے' روزوں کی تعداد' زمانہ اور آداب و شرائط کے اعتبار سے نہیں ہے'کیونکہ یہ بات ہم کو معلوم ہے کہ شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور سابقہ انبیاء و رسل کی شرائع میں فرق رہا ہے۔

دوسری بات یہ سمجھائی گئی کہ تمہیں اس مشقت و تکلیف میں ڈال کر اللہ تعالیٰ کو کوئی مسرت حاصل نہیں ہوتی' معاذ اللہ! بلکہ اس میں تمہارے لئے مصلحت مضمر ہے۔ اور وہ کیا ہے! "تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے"۔ گویا روزے کی مصلحت ہے تقویٰ۔ تقویٰ کے معنی اور مفہوم کو جان لینے سے یہ مصلحت اور حکمت بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ "تقویٰ" کے معنی ہیں بچنا۔ قرآن مجید نے اس میں اصطلاحی مفاہیم پیدا کئے' یعنی اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا' حرام سے بچنا' معصیت سے بچنا' یہ تقویٰ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے نفس کے بعض تقاضے بہت منہ زور ہیں۔ مثلاً پیٹ کھانے کو مانگتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی حلال چیز کھانے کو نہیں ہے تو اگر کوئی مسلمان بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو جائے تو حرام میں منہ مار بیٹھے گا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس میں یہ عادت ڈالی جائے کہ آخری حد تک بھوک پر قابو پانے میں کامیاب رہے ۔ اسی طرح پیاس کو کنٹرول میں لائے ' شہوت کو کنٹرول میں رکھے۔ ساتھ ہی نفس کی ان خواہشات پر بھی قابو پانے کی مشق حاصل ہو جو دین کے منافی ہوں۔ لہٰذا طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور تعلقِ زن و شو سے کنارہ کش ہونے کی جو مشق کرائی جاتی ہے'اس کا حاصل ہے ضبطِ نفس --- مقصود یہ ہے کہ ایک بندۂ مومن کو اپنے نفس کے منہ زور گھوڑے کے تقاضوں پر قابو پانے اور کنٹرول میں رکھنے کی مشق ہو جائے اور اس کی عادت پیدا ہو جائے۔

صوم کی فرضیت کے حکم کیساتھ "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" بظاہر ایک چھوٹا سا فقرہ ہے' لیکن غور و تدبر کیا جائے تو یہ دو لفظی جملہ بڑا ہی پیارا' نہایت عجیب اور بڑی جامعیت کا حامل ہے۔ اس کے اندر روزے کی ساری ظاہری و باطنی اور انفرادی و اجتماعی فضیلتیں آگئیں۔ اور یہ بات روزِ روشن کی طرح مبرہن ہو گئی کہ روزے کا مقصود حصولِ تقویٰ ہے' بالخصوص نفس کا تقویٰ---- یعنی اللہ کی محبت کے شوق اور اللہ کی نافرمانی کی سزا کے خوف سے اللہ کے اوامر و نواہی پر استقلال کے ساتھ مستقیم رہنے کے لئے اپنے نفسِ

امارہ کو قابو میں رکھنے کی تربیت اور ٹریننگ حاصل کرنا۔ اسی کے لئے ہمارے دین کی ایک اور معروف و جامع اصطلاح ہے "تزکیہ"۔

اب یہاں ایک بات کا اور اضافہ کر لیجئے کہ غیبت' جھوٹ' فحش باتیں' بدزبانی اور دل آزاری وغیرہ قسم کے گناہوں سے بچنے کی قرآن و حدیث میں بڑی تاکید آئی ہے۔ لیکن حدیث شریف میں خاص طور پر روزے کی حالت میں ان گناہوں سے بچنے کی تاکید مزید شدت کے ساتھ آئی ہے کہ اگر روزے دار نے ان گناہوں سے اجتناب نہیں کیا تو اس روزے سے سوائے فاقے کے اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس کے ضمن میں چند احادیث شریفہ میں ان شاء اللہ آگے بیان کروں گا۔

اگلی آیت کا آغاز جن الفاظ سے ہوتا ہے ان میں اہل ایمان کے لئے تسلی کا سامان ہے کہ گھبراؤ نہیں: "گنتی کے چند دن ہی تو ہیں!" ــــ میں نے ترجمہ میں جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس لئے کہ یہاں لفظ "معدودات" آیا ہے۔ اس وزن پر جمع قلت آتی ہے اور جمع قلت کا اطلاق نو سے کم پر ہوتا ہے۔ اس سے بھی یہ دلیل ملتی ہے کہ یہ ایامِ بیض کے تین روزوں سے متعلق ابتدائی حکم ہے۔ انتیس یا تیس دن کے روزے تو "**اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ**" شمار نہیں ہو سکتے۔ پھر اس میں مزید رعایت بیان فرمائی: "پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ تعداد پوری کر لے دوسرے دنوں میں"۔ آگے فرمایا: "اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں (پھر نہ رکھیں) تو ان کے ذمہ (ایک روزہ کا) فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے"۔ اس رعایت کا تعلق بھی ایامِ بیض کے روزوں سے تھا۔ آگے تشویق دلائی گئی: "پھر جو اپنی خوشی سے زیادہ نیکی کمائے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے' ـــ اس کے معنی یہ ہوئے کہ روزہ بھی رکھو اور ایک مسکین کو کھانا بھی کھلاؤ تو کیا کہنے' یہ نورٌ علیٰ نور والا معاملہ ہوگا۔ آگے ارشاد ہوا: "اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھ سے کام لو" ــــ اس سے بھی یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ رعایت خصوصی ہے ورنہ پسندیدہ طرزِ عمل یہی ہے کہ ایک مسکین کو روزے کے فدیہ کے طور پر کھانا کھلانے کی بجائے خود روزہ رکھو۔

اب آگے اس نوع کی تیسری آیت آتی ہے جو کچھ عرصہ کے بعد نازل ہوئی' لیکن مضمون کی مناسبت سے اس کو اور بقیہ تین آیات کو اسی مقام پر شامل کر دیا گیا' جیسے سورۃ

المزمل کے متعلق قرآن مجید کا ہر قاری جانتا ہے کہ یہ مکی سورت ہے' لیکن اس کا دوسرا رکوع جو صرف ایک آیت پر مشتمل ہے' وہ اگرچہ بعد میں مدنی دور میں نازل ہوا لیکن مضمون کی مناسبت سے اسے سورۃ المزمل کے ساتھ رکھا گیا۔ اسی طریقے سے یہاں بھی زمانی اعتبار سے اگلی آیت اور پچھلی دو آیات میں بُعد ہے لیکن موضوع کی مناسبت سے اسے پہلے حکم کے ساتھ شامل کردیا گیا ہے۔

اب اگلی آیت کے مطالعہ کی طرف توجہات کو مبذول فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے:
"رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا' لوگوں کے لئے ہدایت و رہنمائی بنا کر" ...اور یہ ہدایت و رہنمائی بھی گنجلک' مبہم یا پہیلیوں کے انداز میں نہیں' بلکہ "ہدایت کے بڑی روشن اور بہت واضح اور حق و باطل میں فرق و تمیز کردینے والے کھلے اور مضبوط دلائل کے ساتھ" ـــ یہاں قرآن حکیم کی متعدد شانوں میں سے تین اہم ترین شانیں بیان ہوئیں کہ (۱) یہ صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب ہے' یہ الھدیٰ ہے' (۲) یہ بینات پر مشتمل ہے اور (۳) یہ الفرقان ہے' حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب ہے۔

آگے فرمایا: "پس جو کوئی بھی تم میں سے اس مہینہ میں موجود ہو اس پر لازم ہے کہ وہ اس ماہ کے روزے رکھے"۔ یہاں کلمہ "فَ" دونوں جگہ فرضیت کا فائدہ دے رہا ہے اور یہ صومِ رمضان کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں **"شھود الشھر"** کے الفاظ نہایت قابل توجہ ہیں' یعنی رمضان کے مہینے کا پالینا۔ یہاں یہ بات جان لیجئے کہ کرۂ ارض پر ایسے منطقے بھی ہیں جہاں چاند شروع مہینہ میں ظاہر ہی نہیں ہوتا۔ جس طرح ایسے خطے بھی ہیں جہاں سورج ہی طلوع نہیں ہوتا یا برائے نام طلوع ہوتا ہے اور وہاں پر گھڑی کے حساب سے نماز ادا کی جاتی ہے۔ لہٰذا وہاں تقویم (جنتری) سے حساب کرکے رمضان کے مہینے کے روزے رکھنے فرض ہوں گے۔ "شھود الشھر" میں یہ بات شامل ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ ایسے الفاظ لاتا ہے جن سے استدلال کرکے ہر منطقے اور خطے کے مسائل کے لئے حل نکالے جاسکتے ہیں۔

اب ایک اور اہم بات پر غور کیجئے کہ روزوں کے لئے کوئی سا بھی مہینہ چنا جاسکتا تھا۔ روزے جس مہینے میں بھی رکھے جاتے ضبطِ نفس کی مشق کا مقصد پورا ہوسکتا تھا' لیکن ان روزوں کے لئے ماہِ رمضان کا انتخاب کیوں ہوا! اس کا جواب شروع ہی میں

دے دیا گیا کہ یہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے' جس میں دن کے روزے کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام اللیل کو تطوع اور مجعول من اللہ قرار دیا ہے جیسا کہ ہم حضرت سلمانؓ فارسی کی روایت میں پڑھ آئے ہیں۔ اس روایت کو تو امام بیہقیؒ اپنی کتاب "شعب الایمان" میں لائے ہیں۔ اب ذرا قیام اللیل کی اہمیت کو جاننے کے لئے امت کے دو جلیل القدر ائمۂ حدیث امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کی وہ حدیث بھی ملاحظہ کر لیجئے جو ان دونوں اماموں" نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وجوب کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

اب پھر آیت نمبر ۱۸۵ کی طرف رجوع کیجئے۔ رمضان کے روزے کے لئے حکم آیا کہ "تم میں سے جو کوئی بھی اس مہینہ میں موجود ہو وہ لازماً اس کے روزے رکھے"۔ چنانچہ اب پورے ماہ کے روزوں کی فرضیت کا حکم آگیا۔ تاہم ایامِ بیض کے روزوں کے لئے جو دو رعایتیں تھیں وہ برقرار رہیں: "اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر لے"۔۔۔ لیکن وہ رعایت جو ایامِ بیض کے حکم کے ساتھ دی گئی تھی کہ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے' اس رعایت کو منسوخ اور ساقط کر دیا گیا۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص حالات میں اس کو برقرار رکھا ہے' جیسے کوئی شخص بہت بوڑھا ہو گیا ہو اور اب اس میں روزہ رکھنے کی بالکل استطاعت ہی باقی نہ رہی ہو' کوئی دائمی مریض ہو جسے اب شفا کی کوئی توقع ہی نہ رہی ہو۔ مثلاً کوئی ٹی بی کی تھرڈ اسٹیج میں ہے یا کوئی ذیابیطس کا دائمی مریض ہے اور اس کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اسی پر دیگر مختلف عوارض و امراض کو قیاس کر لیجئے۔ ایسے لوگوں کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رعایت برقرار رکھی ہے کہ وہ فی روزہ ایک مسکین کو دو وقت کا پیٹ بھر کر کھانا کھلادیں۔ کھانے کی جگہ اناج کی مقدار اور چند دوسری شرائط کا بھی تعین کیا گیا ہے۔ الغرض خاص حالات میں اس رعایت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رکھا ہے۔

اہلِ سنت کے نزدیک یہ بات اصولاً طے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اختیار ہے کہ آپؐ قرآن کے خاص کو عام اور قرآن کے عام کو خاص کر سکتے ہیں' قرآن کے حکم پر اضافہ فرما سکتے ہیں اور قرآن کے حکم کی تبیین میں مزید حکم دے سکتے ہیں۔ یہ

منکرینِ سنت کی گمراہی ہے کہ وہ حضورؐ کی سنت اور آپؐ کے احکام کو دین میں حجت نہیں مانتے' حالانکہ بعض احادیثِ صحیحہ میں بصراحت آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "یہ نہ سمجھنا کہ کھانے پینے کی صرف وہی چیزیں حرام ہیں جن کا قرآن میں ذکر موجود ہے۔ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جن کی حرمت کا میں تمہیں حکم دے رہا ہوں"۔ یا جیسے قرآن مجید میں حکم آیا کہ ایک شخص بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں نہیں رکھ سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مزید عام کردیا کہ پھوپھی کے ساتھ بھتیجی اور خالہ کے ساتھ بھانجی کو بھی روایت کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ' بخش دیئے گئے اس کے تمام سابقہ گناہ۔ اور جس نے (راتوں کو) قیام کیا رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ' بخش دیئے گئے اس کے جملہ سابقہ گناہ" (بخاری و مسلم)

آپ نے دیکھا' صحیحین کی اس حدیث کی رو سے صیام اور قیام بالکل ہم وزن اور متوازی و مساوی قرار پاتے ہیں! اس حدیث میں "قَامَ" کا جو لفظ آیا ہے جس کا ترجمہ میں نے "راتوں کو قیام" کیا ہے تو اس کے لئے بطور دلیل میں آپ کو حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث سناتا ہوں جسے امام بیہقی رحمہ اللہ نے "شعب الایمان" میں روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے۔ (یعنی اس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر اس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سنے گا!) روزہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تھا' آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما (اور اس کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرما!) اور قرآن کہے گا کہ میں نے اس کو رات کے سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا' خداوند! آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما (اور اس کے ساتھ بخشش اور عنایت کا معاملہ فرما!) چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندہ کے حق میں قبول فرمائی جائے گی۔ (اور اس کے لئے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرمادیا جائے گا! اور خاص مراحمِ خسروانہ سے اس کو نوازا جائے گا)"۔

اس حدیث شریف سے یہ بات بالکل منقح اور مبرہن ہو گئی کہ حضرت سلمان فارسیؓ کی حدیث میں جس قیام کا ذکر ہے اس سے اصل مراد اور اس کا اصل مدعا و منشأ یہ ہے کہ رمضان کی راتیں یا ان کا زیادہ سے زیادہ حصہ قرآن مجید کے ساتھ بسر کیا جائے۔ یقیناً اب آپ لوگ سمجھ لیں گے کہ میری اس رائے کی بنیاد کیا ہے کہ پوری رات قرآن کے ساتھ بسر ہونی چاہیے۔ اس حدیث سے نہ صرف یہ مترشح ہوتا ہے کہ افضل عمل یہ ہے کہ رمضان کی پوری رات قرآن مجید کے ساتھ گزرے' بلکہ اس کی رو سے یہ بات بیک وقت نکاح میں نہیں رکھا جاسکتا۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔ اس وقت میں نے چند مثالیں اس لئے دی ہیں کہ اگر کسی شخص کے ذہن میں یہ اشکال ہو کہ حضورؐ نے بوڑھوں اور دائمی مریضوں کے لئے رمضان کے روزے کے فدیہ کو برقرار کیسے رکھا تو وہ اشکال رفع ہوجائے اور یہ بات واضح ہوجائے کہ یہ چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں شامل ہیں اور ان کا آپؐ کو حق حاصل ہے۔

آگے چلئے' ابھی آیت نمبر ۱۸۵ ہی کا سلسلہ جاری ہے۔ فرمایا: "اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے دشواری و سختی اور تنگی نہیں چاہتا"۔ یعنی یہ ساری رعایتیں اور سہولتیں جو بیان ہوئیں اس سے اللہ کا مقصود بندوں کے حق میں آسانیاں فراہم کرنا ہے' نہ کہ دشواریاں' سختیاں اور تنگیاں۔ لہٰذا بیماری یا سفر کی وجہ سے جو روزے قضا ہوجائیں' بعد میں ان کی تکمیل کرلو۔ یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ یہ نیکی اور تقویٰ کا غلط تصور ہے کہ ایک سو چار ڈگری کا بخار ہے لیکن روزہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ سفر پر جارہے ہیں اور روزوں کا اہتمام و التزام بھی ہورہا ہے۔ یہ درحقیقت اپنے اوپر تشدد ہے اور یہ ایک طرح کا کفرانِ نعمت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رعایتیں دی ہیں' آپ ان سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ اکثر لوگوں کو خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ آج کل کا سفر بھی کون سا مشکل سفر ہے' حالانکہ آپ کو کیا پتہ کہ آپ کراچی سے لاہور کے لئے ریل میں چلیں اور راستہ میں گاڑی کسی پلیٹ فارم پر پانچ چھ گھنٹے کے لئے رک جائے۔ اب آپ کیا کریں گے؟ اسی پر قیاس کرلیجئے کہ آج کل کے سفر میں بھی کس طرح کی تکالیف آسکتی ہیں۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے رعایت دی ہے تو کسی کا اس سے استفادہ کرنے کو ہرگز گھٹیا بات نہ سمجھئے بلکہ اس کے لئے اصول دے دیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کا ارشاد مبارک ہے: "لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرو، سختی اور تنگی پیدا نہ کرو"۔ صحیح احادیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سفر میں روزہ رکھنا نیکی کی بات نہیں ہے"۔ یہ درحقیقت اپنے اوپر تشدد ہے جو اللہ کو پسند نہیں ہے۔ اس موقع پر ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ بلاغتِ قرآنی کا یہ ایک عام اسلوب ہے۔ لہٰذا آیت کے اس حصہ میں یسر و عسر کا معاملہ صرف صیام ہی پر موقوف نہیں ہے۔ اللہ کے ہر حکم کی تہہ میں بندوں کے حق میں رحمتیں اور مصلحتیں ہی ملیں گی۔ جہاں کوئی دشواری یا معذوری پیش آسکتی ہو وہاں کوئی نہ کوئی مناسب و متناسب رعایت یا رخصت رکھ دی گئی ہے۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ کے فوراً بعد فرمایا: **وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ**.... یہ رعایتیں ہیں، لیکن چھوٹ نہیں ہے۔ یہ اس لئے رکھی گئی ہیں "تاکہ (بعد میں) تم تعداد پوری کر لو"۔ تعداد بہرحال پوری کرنی پڑے گی۔ یہ نہیں ہے کہ آپ فدیہ دے کر روزہ رکھنے سے بچ جائیں۔ آگے فرمایا: "اور تاکہ تم اپنے رب کی تکبیر کرو (اس کی کبریائی کا اظہار کرو) اس پر کہ جو اس نے تمہیں راہِ راست دکھائی (جو ہدایت تمہیں عطا فرمائی) اور تاکہ تم شکرگزار بن کر رہو"۔ یہ تکبیر کیا ہے اور یہ شکر کیا ہے؟ وہ یہ کہ تم کو اندازہ ہو، آگہی ہو، شعور و ادراک ہو کہ یہ قرآن اللہ کی کتنی عظیم نعمت اور کتنی بڑی دولت ہے!

اب یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اس نعمت اور دولت کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کب اور کیسے ہوگا۔ یہ بات سطوت و عظمتِ قرآن سے متعلق ہے اور ہمارے غور و فکر کے لئے اس آیت میں ایک اہم نکتہ ہے۔ اس مقام پر قرآن مجید کو **"هُدًى لِّلنَّاسِ"** فرمایا گیا ہے، یعنی اسے تمام انسانوں کے لئے ہدایت قرار دیا گیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سورۃ البقرہ کے بالکل آغاز میں اسی قرآن کے متعلق فرمایا جاتا ہے **هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** "یہ متقیوں کے لئے ہدایت ہے"۔ اب ان دونوں باتوں میں جو ربط و تعلق ہے، اسے سمجھنا ہوگا۔ قرآن مجید میں بذاتہٖ اور فی نفسہٖ تو ہدایت کا سامان پوری نوعِ انسانی کے لئے موجود ہے، لیکن اس سے ہدایت وہی حاصل کرے گا جس میں تقویٰ کی کچھ نہ کچھ رمق اور تلاشِ حق کی کچھ نہ کچھ طلب موجود ہو۔ یہ چیز ابوجہل میں نہیں تھی چنانچہ وہ خالی رہا، وہ قرآن کی ہدایت سے استفادہ نہیں کرسکا اور اس سے محروم رہا۔ ابولہب کیوں محروم رہا؟ اس

لئے کہ اس میں بھی نہ تو تقویٰ کی کوئی رمق تھی اور نہ ہی خدا ترسی کا مادہ تھا۔ گویا ہدایت کی طلب ہی موجود نہیں تھی۔ تو جب تک طلب موجود نہ ہو کوئی استفادہ کیسے کرے! جیسے آپ کو معلوم ہے کہ جب تک پیاس نہ لگے' اس وقت تک آپ کو پانی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر پیاس کے باعث جان پر بنی ہو تو بڑے سے بڑا بادشاہ بھی ایک گھونٹ پانی کے عوض اپنی پوری سلطنت دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ شدید بھوک لگی ہوئی ہو تو سوکھی روٹی بھی پراٹھا معلوم ہوگی۔ لیکن اگر بھوک نہیں ہے تو عمدہ سے عمدہ غذا کی طرف بھی طبیعت راغب نہیں ہو گی ــــــ پس معلوم ہوا کہ جب تک طلب نہ ہو اس وقت تک کسی شے کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ طلب پیدا کرنے کے لئے تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔ اس روزے سے تمہارے اندر تقویٰ ابھرے گا۔ اب اس تقویٰ کی پونجی کو لے کر رات کو اپنے رب کے حضور کھڑے ہو جاؤ تاکہ تمہارے قلب پر اس قرآن کا نزول ہو۔ یہ بارانِ رحمت' یہ بارش جان افزا جب تم پر برسے گی تب تم کو احساس ہو گا کہ یہ کتنی عظیم نعمت ہے' کتنی بڑی دولت ہے اور اللہ کا کتنا بڑا انعام اور احسان ہے کہ اس نے ہمیں یہ کلامِ پاک عطا فرمایا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ قرآن مجید اللہ کی صفت ہے۔ ہماری اصوات اور حروف والفاظ میں مصحف کے اندر لکھی ہوئی اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام ہمارے سامنے ہے۔ اس قرآن کے ذریعہ سے ہمیں اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ وہ ہم سے کلام فرما رہا ہوتا ہے اور ہم اس سے مناجات کر رہے ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جو بڑے پیارے اور دل نشین الفاظ میں علامہ اقبال نے ان اشعار میں کہی ہے۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست او
زندہ و پائندہ و گویاست او
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

(مفہوم) ...."اس کتاب کے بارے میں جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے' اسے اعلانیہ

ہی کہہ گزروں! حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے! یہ ذاتِ حق سبحانہ' وتعالیٰ کا کلام ہے۔ لہٰذا اسی کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی' اور جیتی جاگتی' بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی۔ یہ کتابِ حکیم جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے' یعنی اس کے لئے پوری دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لئے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے!"

یہ قرآن مجید' یہ کلامِ ربانی روح کے تغذیہ و تقویت کا سبب ہے۔ اب جبکہ اس روح کو اس کی اصل غذا ملے گی تو وہ اس سے از سرِ نو قوی اور توانا ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہوگی اور "اپنے مرکز کی طرف پرواز" کا نقشہ پیش کرے گی تو تمہارے قلب کی گہرائیوں سے اللہ کے شکر کا چشمہ ابل پڑے گا۔ پھر اس شکر کا نتیجہ کیا نکلے گا' اس کا بڑا پیارا بیان اگلی آیت (نمبر۱۸۶) میں ہے۔ فرمایا: "اور اے نبی! جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں (تو آپ' کہہ دیجئے) میں نزدیک ہی ہوں"۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال و جواب ایک علیحدہ سی بات ہے اور یہ صیام کے احکام کے ضمن میں کیسے آگئی! لیکن غور کیجئے تو صاف سمجھ میں آجائے گا کہ جب صیام و قیام کے نتیجہ میں ایک بندۂ مومن کی روح کو جلا ملی اور جب اس کے قلب میں شکر کا جذبہ ابھرا تو اس کا عین تقاضا ہے کہ تعلق مع اللہ کے جوش و ولولہ میں شدت پیدا ہو۔ طبیعت میں اللہ سے مانگنے' اس سے سوال کرنے' اس کے آگے ہاتھ پھیلانے' اس کے سامنے گڑگڑانے' اس سے استغفار کرنے' اس سے عفو و مغفرت طلب کرنے' اس کی طرف رجوع کرنے اور اپنی خطاؤں' معصیتوں اور لغزشوں سے توبہ کرنے کے جذبات موجزن ہوں۔ گویا اب بندہ اللہ کی طرف ہمہ تن اور پوری یک سوئی سے متوجہ ہو۔ اب فطری طور پر دل میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ میرا رب مجھ سے کتنا دور ہے؟ لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے کہ اے نبیؐ جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے دریافت کریں تو میری طرف سے ان سے کہہ دیجئے کہ میں نزدیک ہی ہوں! اور اگلی بات یہ فرمائی: "میں تو ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب مجھے پکارے" ..... یہ تو تم ہو کہ ہماری طرف رخ نہیں کرتے اور متوجہ نہیں ہوتے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں!
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں!

اللہ سے دوری کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ وہ تو ہر جگہ ہر آن موجود ہے، ہماری توجہات کسی اور طرف ہیں۔ آپ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں "میں نے متوجہ کر لیا ہے اپنے چہرے کو اسی (اللہ) کی طرف جس نے بنائے آسمان اور زمین، سب سے یک سُو ہو کر اور میں نہیں ہوں مشرکوں میں سے"۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ الفاظ کہہ دینے کے باوجود اللہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی، توجہ اپنے حساب کتاب میں رہتی ہے، دماغ اپنے دنیوی معاملات ہی کی چکی پیستا رہتا ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں یہ بتایا جارہا ہے کہ رمضان و قرآن اور صیام و قیام کا جو مشترک نتیجہ نکلے گا وہ یہ ہے کہ تمہاری روح بیدار ہوگی، تقویت پائے گی اور اللہ کی طرف متوجہ ہوگی۔ تو اس لئے خوشخبری ہے کہ میں کہیں دور نہیں ہوں۔ مجھے تلاش کرنے کے لئے کہیں بیابانوں میں جانے کی اور پہاڑوں کی غاروں میں تپسیائیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں تو تمہارے بالکل قریب ہی ہوں۔ گویا ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایک جاہلانہ تصور یہ قائم کر لیا گیا ہے کہ اس تک براہِ راست رسائی ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ مختلف مذاہب میں اللہ کے دربار تک رسائی کے لئے بے شمار واسطے اور وسیلے گھڑ لئے گئے ہیں اور ناقابلِ فہم مشرکانہ نظام بنا لئے گئے ہیں۔ قرآن نے اس دہم کو دور کر کے صاف صاف بتا دیا ہے کہ تم جسے دور سمجھ رہے ہو، وہ دور نہیں ہے تمہارے بالکل قریب ہے۔ اس سے ہم کلام ہونے کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے، جب چاہو اور جہاں چاہو اس سے ہم کلام ہو جاؤ۔ علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں نقشہ کھینچا ہے کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ یہ جو میرے دربان بن کر بیٹھ گئے ہیں کہ ان کو خوش کئے بغیر مجھ تک رسائی نہیں ہو سکتی، یہ سب ڈھکوسلہ ہے، ان کو یہاں سے ہٹا دو۔ میرا دربار ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ علامہ کا شعر ہے ؎

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

ایسا نہیں ہے کہ تمہاری دعا کسی پوپ' کسی پادری' کسی پجاری' کسی پنڈت' کسی پروہت یا کسی پیر ہی کی وساطت سے مجھ تک پہنچ سکتی ہے! (دیکھئے عجب اتفاق ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان حائل ہونے والے سب مہاشوں کے نام "پ" ہی سے شروع ہوتے ہیں) تو ان سب خود ساختہ واسطوں اور وسیلوں کو درمیان میں سے ہٹا دو۔ اللہ کا ربط و تعلق بندے کے ساتھ براہِ راست ہے۔ اور اس کے لئے کسی واسطے کی ضرورت ہی نہیں! اس تعلق کے مابین حجاب ہم خود ہیں۔ اپنی غفلتوں کا پردہ چاک کیجئے اور اللہ کی جناب میں توبہ کیجئے! وہ ہر آن' ہر لحظہ تمہاری دعا کو سننے والا ہے۔ وہ ہمیشہ ہی قریب رہتا ہے اور رمضان میں تو اس عموم میں خصوص پیدا ہوجاتا ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ آیت مبارکہ کے اس حصہ میں ہمارے لئے کتنی بشارت' تسلی' تسکین اور راحت کا سامان رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں انسان کیلئے کتنی آزادی کا پیغام ہے! آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں "انسانی حقوق کے منشور" (MAGNACHARTA) کی بہت دھوم ہے' جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا میگنا کارٹا اور کوئی نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ربط و تعلق' اس سے فریاد' اس سے استغاثہ' اس سے استعانت اور اس سے حاجت روائی کی درخواست میں کوئی واسطہ حائل نہیں ہے۔

میں صوفیائے کرام کے سلسلۂ ارشاد کی نفی نہیں کررہا۔ کوئی خدا ترس مرشد ہو جو قرآن وسنت کی روشنی میں تزکیہ نفس کرنے اور صحیح طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر چلانے والا ہو تو **كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ** کی قرآنی ہدایت کے مطابق ایسے مرشدین سے ضرور فیض حاصل کرنا چاہئے' لیکن ہمارے یہاں پیری مریدی کا جو عام اور غلط تصور رائج ہے اس کے اعتبار سے میں اس کی نفی کررہا ہوں۔

البتہ ایک بات ملحوظ رہے۔ آیت کے اس حصہ میں پکارنے والے کی ہر پکار سننے اور اس کا جواب دینے کا ذکر ہے۔ یہاں یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ ہر دعا کے قبول کرنے کا حتمی وعدہ بھی ہے۔ بیچارے بندے کو کیا خبر کہ وہ جو دنیوی چیز اللہ سے مانگ رہا ہے' اس میں اس کیلئے خیر ہے یا شر! کون سی شے اس کے حق میں مفید ہوگی اور کون سی مضر! لہٰذا

دعائیں وہی قبول ہوں گی جو اللہ کی رحمت و حکمتِ مطلقہ کے منافی نہیں ہوں گی۔ لیکن نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوش خبری دی ہے کہ بندۂ مومن کی کوئی دعا نہ رد ہوتی ہے' نہ ضائع۔ وہ جس چیز کیلئے دعا کرتا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کے علمِ کامل میں بندے کے حق میں مفید ہوتی ہے تو اسے وہی عطا کردی جاتی ہے۔ یا پھر اسے اس سے بہتر چیز عنایت ہوجاتی ہے۔ یا پھر اللہ رب الکریم اس دعا کو بندے کے حق میں نیکی قرار دے کر اس کے اجر وثواب کو آخرت کے لئے محفوظ فرمالیتا ہے۔ اس دعا کے عوض اس کے نامۂ اعمال میں سے بہت سی برائیوں کے داغ دھودیئے جاتے ہیں۔ الغرض بندۂ مومن کی کوئی دعا ضائع نہیں ہوتی۔ وہ کسی نہ کسی صورت میں قبول ہوتی ہے۔

اب اس آیت مبارکہ کا اگلا حصہ پڑھئے۔ اس میں دو شرطوں کا بیان آرہا ہے۔ پہلی یہ کہ "فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ" اور دوسری یہ کہ "وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ"۔ ان دونوں کو سمجھنا ہوگا۔ پہلی شرط میں فرمایا کہ میرے بندوں کو بھی چاہئے کہ میرا حکم مانیں' میری پکار پر لبیک کہیں' میں جب پکاروں فوراً حاضر ہو جائیں' جس چیز کا حکم دوں بجالائیں' جس کام سے اور جس چیز سے روک دوں' رک جائیں۔ یکطرفہ معاملہ نہیں چلے گا۔ آپ کو قرآن مجید میں یہ بات متعدد جگہ ملے گی کہ اللہ تعالیٰ یکطرفہ معاملہ نہیں فرماتا۔ جیسے سورۃ البقرہ میں فرمایا: "اور تم اس عہد کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا ہے' میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے"۔ اور جیسے سورۂ ابراہیم میں فرمایا: "اگر تم ہمارا شکر کروگے تو ہم تمہیں اور زیادہ نعمتیں دیں گے اور اگر تم نے ناشکری کی تو پھر ہمارا عذاب بھی بڑا سخت ہوگا"۔ اسی طرح سورۂ محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں فرمایا: "اے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا"۔ تم اللہ (کے دین) کی مدد نہ کرو بلکہ اس کے دشمنوں سے ساز باز کرو' اس کے باغیوں سے یارانہ گانٹھو اور چاہو کہ اللہ تمہاری مدد کرے تو یہ نہیں ہوگا! تو معاملہ دو طرفہ ہوگا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری دعائیں قبول کروں تو تم بھی میری پکار پر لبیک کہو اور میرے احکام قبول کرو! اور دوسری شرط یہ کہ "انہیں چاہئے کہ مجھ پر ایمان پختہ رکھیں"۔ اس آیت کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظِ مبارکہ پر: لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ "تاکہ ان پر فوز و فلاح اور رُشد وہدایت کی راہیں کھل جائیں اور یہ ان راہوں پر گامزن ہوجائیں"۔

اگلی آیت (نمبر ۱۸۷) میں روزے سے متعلق احکام ہیں۔ اس رکوع کی آخری آیت (نمبر ۱۸۸) کا بظاہر رمضان کے روزوں سے تعلق معلوم نہیں ہوتا' لیکن حقیقت میں بہت گہرا تعلق ہے۔ اس لئے کہ دو مقامات پر بڑے شد و مد سے روزوں کی غایت تقویٰ بیان فرمائی گئی ہے۔ اس کے متعلق سوچنا پڑے گا کہ اس تقویٰ کا "معیار" کیا ہے اور اس کا عملی ظہور کس طور سے ہوگا! کیا تقویٰ کا تعلق کسی خاص قسم کی وضع قطع سے ہے؟ نہیں' بلکہ تقویٰ کا اصل معیار اکلِ حلال ہے! اکلِ حلال ہے تو تقویٰ ہے' یہ نہیں ہے تو تقویٰ نہیں ہے۔ چاہے کتنی ہی شکل و صورت اور وضع قطع ان چیزوں کے مطابق بنالی گئی ہو جن کو عام طور پر "تقویٰ" سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ اصل تقویٰ نہیں ہے۔ عبادتوں کے کتنے ہی ڈھیر لگالئے گئے ہوں اور ہر سال عمرے پر عمرے اور حج پر حج کئے جارہے ہوں تو یہ بھی اصل تقویٰ نہیں ہے۔ تقویٰ کا اصل معیار اس آیۂ مبارکہ میں بیان کیا جارہا ہے۔ یہ اہم بات سمجھنے کی ہے کہ روزے میں آپ حلال چیزیں کیوں نہیں کھاتے! تعلق زن و شو قائم کیوں نہیں کرتے! اس لئے کہ اللہ کا حکم نہیں ہے۔ لیکن روزے کی حالت میں اگر آپ دوسرے نواہیِ شریعت کا ارتکاب کررہے ہیں تو آپ نے درحقیقت روزہ رکھا ہی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑتا تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے"۔ چنانچہ فرمایا: "اور آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے مت کھاؤ" یعنی حرام طریقوں سے ایک دوسرے کے مال ہڑپ نہ کرو۔ "اور اپنے اموال کو (رشوت کے طور پر اور ناجائز طریقوں سے دے دلا کر) حکام تک پہنچنے کا ذریعہ مت بناؤ کہ اس طرح لوگوں کے مال کا کچھ حصہ جانتے بوجھتے ناحق اور گناہ سے ہضم کرجاؤ"۔ یعنی ایسا نہ کرنا کہ حکام کو رشوت دی اور کسی کا حق اپنے نام کرالیا۔ اس رکوع کی یہ آخری آیت اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس نے ہمارے سامنے حقیقی تقویٰ کا ایک معیار رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم ان تمام نواہی اور منکرات سے بچ سکیں جن سے ہمارا دین ہمیں بچانا چاہتا ہے اور صحیح تقویٰ اختیار کرنے کے لئے ہمارے دلوں میں طلبِ صادق پیدا فرمائے اور اس پر پوری زندگی مستقیم رہنے کے لئے ہماری نصرت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!!

انقلابی عمل کے فہم کا واحد ذریعہ

ڈاکٹر اسرار احمد

گزشتہ ہفتے دو قسطوں میں جو گزارشات پیش کی گئیں ان کا حاصل اورلبِ لباب یہ دو امور ہیں:

۱۔ اسلام صرف مذہب نہیں' کامل دین ہے۔ چنانچہ اس میں جہاں عقائد' عبادات' معاشرتی رسومات اور دیگر احوالِ شخصیہ شامل ہیں' وہاں معاشرت و معیشت اور سیاست و ریاست سمیت انسان کی اجتماعی زندگی کے تمام شعبے اور گوشے بھی شامل ہیں اور اسلام ان سب پر اپنی غیر مشروط بالادستی چاہتا ہے۔

۲۔ بحیثیت دین' اسلام کی اعلیٰ ترین قدر اور اس کا منتہائے مقصود عدلِ اجتماعی یعنی سوشل جسٹس ہے اور اسلام ایک ایسا معاشرہ اور ریاست وجود میں لانا چاہتا ہے جس میں سماجی اور قانونی سطح پر کامل مساوات ہو' سیاسی اور ریاستی سطح پر اللہ کے سوا کسی اور کی غلامی نہ ہو اور معاشی و اقتصادی سطح پر نہ صرف یہ کہ استحصال نہ ہو' بلکہ کفالتِ عامہ کا ایسا اہتمام کیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ سکون اور دلجمعی کے ساتھ اپنے خالق و مالک کی معرفت بھی حاصل کر سکیں اور اس سے لو بھی لگا سکیں۔

اس سے قبل ان کالموں میں جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے اس کے بھی دو اہم نتائج کو ذہن میں مستحضر کر لیں:

۱۔ انقلاب انسان کی حیاتِ اجتماعی کے کم از کم کسی ایک گوشے میں اساسی اور بنیادی تبدیلی کا نام ہے' چنانچہ فرانس کا دو صدی قبل کا انقلاب بھی انقلاب کہلانے کا مستحق ہے' اس لئے کہ اس میں سیاسی ڈھانچہ تبدیل ہو گیا تھا اور اسی طرح اس

صدی کے آغاز کا روس کا انقلاب بھی واقعتاً انقلاب تھا' اس لئے کہ اس سے معاشی نظام میں بنیادی تبدیلی واقع ہوگئی تھی' جبکہ اس کے برعکس تیسری صدی عیسوی میں پوری سلطنت روما کی مذہبی تبدیلی کو انقلاب نہ کہا گیا ہے نہ کہا جاسکتا ہے! اس لئے کہ اس سے نظامِ اجتماعی کے کسی بھی گوشے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

۴۔ تاریخِ انسانی کا عظیم ترین اور ہمہ گیر ترین انقلاب وہ تھا جو اب سے چودہ سو سال قبل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرہ نمائے عرب میں برپا کیا' اس لئے کہ اس میں نہ صرف "مذہب" تبدیل ہوگیا تھا بلکہ اجتماعی نظام بھی پورے کا پورا سر سے پیر تک اور جڑ سے چوٹی تک بدل کر رہ گیا تھا۔ اس پر غیروں میں سے ایم این رائے' ایچ جی ویلز' اور ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کی گواہیاں تو پیش کی جاچکی ہیں' ان پر اضافہ کرلیں گاندھی جی کی اس بالواسطہ گواہی کا جو انہوں نے اس صورت میں دی تھی کہ جب ۱۹۳۷ء میں پہلی بار برٹش انڈیا میں صوبائی وزارتیں بنیں جو سب کی سب کانگریس کی تھیں تو انہوں نے اپنے اخبار "ہریجن" میں مقالہ لکھا اور تمام وزراء کو ہدایت کی "آپ لوگ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نقشِ قدم کی پیروی کریں" اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں حضرات شخصی اعتبار سے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کے شجرۂ طیبہ ہی کے برگ و بار تھے اور انہوں نے جس نظام کو چلایا وہ بھی انقلابِ نبویؐ کے ذریعے قائم ہوا تھا!

ان چار باتوں پر ایک پانچویں حقیقت واقعی کا اضافہ کرلیا جائے تو ہم ایک اہم نتیجے تک پہنچ جائیں گے۔ وہ پانچویں بات یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عظیم اور کلی انقلاب عام انسانی زندگی کے اوسط عرصے یعنی کل بیس برس میں برپا کردیا اور اس کے جملہ مراحل کو بنفسِ نفیس اپنی ہی رہنمائی اور ذاتی قیادت و سیادت میں طے کیا' چنانچہ ۶۱۰ء میں ایک فردِ واحد کی حیثیت سے دعوت کا آغاز فرما کر ۶۳۰ء تک جزیرہ نمائے عرب میں انقلاب کی تکمیل کردی' اس لئے کہ ۶۳۲ء میں آنحضورؐ کی وفات تک کے بقیہ دو سال انقلابِ محمدیؐ کی بین الاقوامی سطح پر توسیع یا جدید

اصطلاح کے مطابق "تصدیر" (ایکسپورٹ) کی مساعی کے مظہر ہیں!

یہ پانچویں حقیقت بھی عربی زبان کے مقولے "اشیاء کی اصل پہچان ان کی اضداد یعنی بالمقابل اشیاء کے حوالے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے!" کے مطابق دوسرے انقلابات سے تقابل کے ذریعے نکھرتی ہے۔ یعنی انقلابِ فرانس کے اصل "داعی" تو والٹیر اور روسو ایسے بہت سے مصنف اور دانشور تھے، لیکن وہ سب کے سب صرف قلم کے دھنی تھے، مردِ میدان نہ تھے، لہٰذا انقلاب کی قیادت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا، اور چونکہ انقلاب عملاً کچھ اوباش لوگوں کی سرکردگی میں برپا ہوا لہٰذا نہایت خونی ثابت ہوا! ـــــ اسی طرح انقلابِ روس کے لئے فکر اور فلسفہ تو مارکس اور اینجلز نے جرمنی اور انگلستان میں بیٹھ کر مرتب کیا تھا، لیکن ان دونوں کی زندگی میں ان کے اپنے ہاتھوں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب برپا نہ ہو سکا، بلکہ یہ انقلاب ان کی موت کے بہت بعد ایک دور دراز ملک روس میں بالشویک اور مانشویک لوگوں کے ہاتھوں اور بالآخر لینن کی رہنمائی میں برپا ہوا ـــــ گویا پوری انسانی تاریخ میں اس کی واحد مثال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے کہ ایک ہی انسان نے کسی انقلابی دعوت کا آغاز بھی کیا اور پھر نہ صرف یہ کہ دعوت، تنظیم اور تربیت کے جملہ مراحل بھی خود طے کئے، بلکہ بعد ازاں اقدام اور چیلنج حتیٰ کہ مسلح تصادم کے مراحل میں بھی خود ہی سیادت و قیادت کی جملہ ذمہ داریاں اس احسن طریق سے ادا کیں کہ ہر مرحلے پر یوں محسوس ہوا کہ شاید آپؐ کی شخصیتِ مبارکہ اور مزاجِ گرامی کی اصل طبعی مناسبت اسی خاص کام سے تھی اور آپؐ خاص طور پر اسی مرحلے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ صلی اللہ علیہ وسلم!

ان پانچ باتوں سے جو قطعی، حتمی اور ناقابل تردید و تکذیب نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہے کہ انقلاب کس طرح برپا کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ انقلابی عمل کے مراحل کون کون سے ہیں؟ اور یہ کہ ہر مرحلے کے لوازم کیا ہیں؟

اور یہ کہ پہلے مرحلے کے بعد دوسرے کی جانب پیش قدمی کی لازمی شرائط کیا ہیں؟ تو اس کے لئے واحد راستہ یہ ہے کہ سیرتِ محمدیؐ کا مطالعہ کرے اور اپنی پوری توجہ کو اس یقین کے ساتھ اس پر مرکوز کردے کہ "جا ایں جاست!" گویا انقلابی عمل کے فہم و شعور کے لئے تو "بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را!" کے سوا کوئی اور چارۂ کار موجود ہی نہیں ہے!

تاہم اس معاملے میں دو وضاحتیں ضروری ہیں:

ایک یہ کہ ہم نے سیرت النبیؐ کہا ہے سنتِ نبویؐ نہیں! اس لئے کہ ہمارے یہاں "سنتِ نبویؐ" کتبِ احادیث میں خالص فقہی ترتیب کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، جس سے اسلامی قانون کے فہم میں تو یقیناً فیصلہ کن مدد ملتی ہے لیکن انقلابی عمل کا شعور و ادراک حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے لامحالہ سیرتِ نبویؐ کی جانب رجوع کرنا پڑے گا اس لئے کہ اس میں واقعاتی ترتیب ملتی ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اولاً کیا اقدامات کئے اور بعد ازاں کیا تدابیر اختیار کیں اور مکہ مکرمہ میں آپؐ کا طرزِ عمل کیا تھا اور ہجرت کے بعد آپؐ کی جدوجہد نے کیا صورت اختیار کی؟ اور ظاہر ہے کہ انقلابی عمل کا فہم و شعور کل کا کل اسی ترتیب میں مضمر ہے!

دوسرے یہ کہ سیرتِ نبویؐ کے ضمن میں بھی واقعات و حوادث جس انداز اور صورت میں ظہور پذیر ہوئے اس سے بڑھ کر ان کے بین السطور جھانکنا ضروری ہے کہ ان کے پس پردہ کیا عوامل و اسباب کار فرما تھے ـــــــ گویا انقلابی عمل کے فہم و شعور کے لئے سیرت سے زیادہ "فلسفۂ سیرت" کو سمجھنا ہوگا، اس لئے بھی کہ اسی پر "فلسفۂ انقلاب" کے فہم کا دار و مدار ہے اور اس لئے بھی کہ اسی کے ذریعے وہ ظاہری "تضادات" حل اور رفع کئے جاسکتے ہیں جن کی جانب ٹائن بی نے تو اس زہر میں بجھے ہوئے جملے کے ذریعے نہایت "بھرپور وار" کے طور پر اشارہ کیا تھا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک نبی کی حیثیت سے تو ناکام ہوگئے تھے، ہاں ایک سیاستدان

کی حیثیت سے کامیاب ہوئے!" ---اور جس کی نہایت ہوشیاری اور چابکدستی سے تشریح اور توضیح کی ہے پروفیسر منٹگمری واٹ نے آنحضورؐ کی سیرتِ مبارکہ کو دو علیحدہ علیحدہ جلدوں میں مرتب کر کے جن میں سے ایک کا عنوان ہے "محمدؐ مکہ میں!" ---- اور دوسری کا عنوان ہے "محمدؐ مدینہ میں!" تاکہ دونوں کے مابین بعد و فصل بلکہ "تضاد" کو نمایاں کردیا جائے!-- ("سادگی اپنی بھی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ" کا تبصرہ علامہ اقبال نے تو مصطفیٰ کمال پاشا کے ہاتھوں تنسیخِ خلافت پر کیا تھا' لیکن اس کا بھرپور اطلاق ہوتا ہے اس پر بھی کہ پروفیسر منٹگمری واٹ کو ان کی تصانیف ہی کی بنا پر حکومتِ پاکستان نے سیرت پر خطاب کے لئے بطور خاص مدعو کیا تھا!)

ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کے پاس الفاظ نہیں ہیں جن کے ذریعے اللہ کا شکر ادا کیا جاسکے کہ اس نے اسے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے انقلابی عمل کے استنباط اور استخراج کی ایسی توفیق عطا فرمائی کہ بلا خوفِ تردید یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ انقلابی عمل کی اس سے زیادہ جامع اور مکمل تعبیر ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی ایک گواہی بھی راقم کو ایک بار ایک "واقفِ راہ" سے مل گئی جب تقریباً چھ سات سال قبل ایف سی کالج لاہور میں منعقد ہونے والے ایک جلسۂ سیرت میں راقم نے سیرت النبیؐ سے ماخوذ اس انقلابی عمل کی تشریح کی تو اس وقت کے پرنسپل ڈاکٹر نسیم زکریا' جو خود پولیٹیکل سائنس کے استاد ہیں' نے فرمایا کہ "میں نے افلاطون کے عہد سے لے کر آج تک اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا سب کا سب مطالعہ کیا ہے لیکن انقلابی عمل کی ایسی واضح اور مکمل تشریح آج تک سامنے نہیں آئی تھی" (اور چونکہ اوپر سابق صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دورِ حکومت کی سیرت کانفرنسوں کا ایک ذکر منفی انداز میں ہوگیا ہے' لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ریکارڈ پر لے آیا جائے کہ راقم ذاتی طور پر جنرل صاحب مرحوم کا ممنونِ احسان ہے کہ انہوں نے جب گذشتہ دہائی کے ابتدائی سالوں میں سیرت کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے

سلسلے میں مختلف مواقع پر مجھے بھی بطورِ خاص مدعو کیا گیا تو میں نے سیرت النبیؐ کے مطالعے کی جانب خصوصی توجہ منعطف کی اور کسی قدر گہرائی میں غور و خوض شروع کیا جس کے نتیجے میں "منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے اسرار و رموز رفتہ رفتہ واضح ہوتے چلے گئے' تا آنکہ اکتوبر ۸۴ء تا دسمبر ۸۴ء گیارہ خطاباتِ جمعہ میں راقم نے فلسفہ و منہجِ انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک تجزیاتی مطالعہ جامع مسجد دار السلام باغ جناح' لاہور میں پیش کردیا --- ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے قبل میں قرآن حکیم کا تو ایک ادنیٰ طالب علم رہا تھا' سیرت اور سنتِ نبویؐ میرے مطالعے اور غور و خوض کے بنیادی موضوع نہیں تھے!)

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ انقلابی عمل کو اگر مختصر ترین الفاظ میں بیان کیا جائے اور دینی اصطلاحات سے گریز کرتے ہوئے عام الفاظ استعمال کئے جائیں (اس لئے کہ صدیوں کے زوال اور انحطاط کے باعث دینی اصطلاحات کے محدود "مذہبی" مفہوم اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ ان کے اصل اور وسیع تر مفہوم کو پیشِ نظر رکھنا بالعموم مشکل ہو جاتا ہے!) تو وہ حسب ذیل چھ مراحل پر مشتمل قرار پاتا ہے:

۱۔ کوئی انقلابی نظریہ ہو اور اس کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کی جائے۔
۲۔ جو لوگ اس نظریئے کو شعوری طور پر قبول اور اختیار کرلیں انہیں منظم کیا جائے اور ان کی صف بندی کی جائے' یعنی ان کے کاڈرز کو مرتب کیا جائے۔
۳۔ ان کی ٹریننگ اور تربیت کا مؤثر انتظام کیا جائے۔

ان تین اقدامات کے نتیجے میں ایک انقلابی قوت وجود میں آتی ہے اور جب تک یہ قوت مقدار میں اس خاص حد تک نہیں پہنچ جاتی کہ رائج الوقت نظام سے براہِ راست ٹکر اور تصادم مول لے سکے اس وقت تک اقبال کے الفاظ ع "بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن!" کے مطابق اپنی پوری توجہ اور کل قوتِ کار کو دوسرے تمام وقتی مسائل اور جزوی معاملات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف ان تین

کاموں ہی پر مرکوز رکھتی ہے تاکہ اس کا حلقۂ اثر و نفوذ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے اور آخری تصادم کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت فراہم ہو سکے۔

۴۔ اس پورے عرصے کے دوران ایک اور مرحلہ جو اگرچہ بیان اور گنتی میں تو چوتھا شمار ہو گا لیکن عملی طور پر پہلے قدم کے ساتھ ہی شروع ہو کر ان تینوں مراحل کے دوران مسلسل جاری رہتا ہے وہ ہے عدم تشدد یا صبرِ محض کا مرحلہ' جسے انگریزی میں "Passive Resistance" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے' یعنی یہ کہ رائج الوقت نظام اور اس کے حامیوں کی جانب سے کسی بھی متشددانہ کارروائی کا جواب جوابی تشدد یا انتقامی کارروائی سے نہ دیا جائے بلکہ تمام مصائب کو برداشت کرتے ہوئے پورے صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ متذکرہ بالا تین کاموں میں پوری تندہی سے مصروف رہا جائے!!

۵۔ یہاں تک کہ جب انقلابی جماعت یہ محسوس کرے کہ اب اس کے پاس اتنی طاقت ہے کہ موجود الوقت نظام سے براہِ راست تصادم مول لے سکے تو اقبال کے الفاظ میں ع "چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن" کے مطابق پانچواں مرحلہ جو اقدام اور چیلنج پر مشتمل ہوجاتا ہے شروع ہوتا ہے جس میں اس نظام کی کسی بھی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کافی ہوتا ہے' جس کے نتیجے میں وہ نظام اپنی پوری طاقت کے ساتھ انقلابی قوت پر حملہ آور ہوتا ہے جو اس کے نتیجے میں "یا تخت یا تختہ" کی فیصلہ کن کیفیت سے دو چار ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ اگر یہ اقدام اور چیلنج مناسب تیاری اور کافی طاقت فراہم کرنے کے بعد کیا گیا ہو تو کامیابی حاصل ہوجاتی ہے اور انقلاب برپا ہوجاتا ہے' بصورتِ دیگر وہ انقلابی قوت کچل کر رکھ دی جاتی ہے۔

اس پانچویں مرحلے ہی کے سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدوجہد کے دوران "مسلح تصادم" کا چھٹا اور آخری مرحلہ بھی آیا تھا جو اندرونِ ملک عرب بھی چھ سال تک جاری رہا اور پھر اس کا تسلسل بیرون ملکِ عرب انقلابِ محمدی (علٰی صاحبہ الصلوٰۃ و السلام) کی توسیع اور تصدیر کی جدوجہد کے ضمن میں برقرار رہا'

جس کا آغاز تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ دنیوی کے آخری دور ہی میں ہو گیا تھا لیکن جو اپنی پوری قوت و شدت کو خلافتِ راشدہ کے دور میں پہنچا!

اب آئندہ ہم' ان شاء اللہ العزیز' ان مراحلِ انقلاب میں سے ایک ایک مرحلے کے بارے میں مختصر گفتگو کریں گے جس میں زیادہ تر ہر مرحلے کے لوازم اور خصائص کی وضاحت کی جائے گی تاکہ حال اور مستقبل کے لئے ضروری رہنمائی سامنے آسکے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ نہایت اختصار سے سیرت النبیؐ کے حوالے سے انقلابِ نبویؐ کے ضمن میں اس مرحلے کا تاریخی اور واقعاتی جائزہ بھی لیا جائے گا' تاکہ یہ اعتماد اور یقین پیدا ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدوجہد واقعتاً ان ہی مراحل سے گزر کر کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی!

ضرورت آفس سپرنٹنڈنٹ

تنظیم اسلامی کے مرکزی دفتر میں کام کرنے کیلئے آفس سپرنٹنڈنٹ کی ضرورت ہے۔ رفیق تنظیم کو ترجیح دی جائے گی۔ خط و کتابت اور دفتری معمولات کا تجربہ ضروری ہے۔ لاہور سے باہر کے رفقاء بھی درخواست دے سکتے ہیں۔ درخواستیں زیادہ سے زیادہ 20 مارچ تک مرکزی دفتر تنظیم اسلامی A _ 67 علامہ اقبال روڈ نزد گڑھی شاہو لاہور پہنچ جانی چاہئیں۔

معتمد عمومی تنظیم اسلامی پاکستان

فتنۂ دجّال

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے خطابات سے ماخوذ

—— مرتب: محمد راشد حفیظ ——

دجالی فتنے کے موضوع پر امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے متعدد خطابات کیسٹوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی جناب محمد راشد حفیظ صاحب نے ان کیسٹوں سے حاصل شدہ مواد کو جمع کر کے ایک مرتب مضمون کی شکل دی ہے اور وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کا سامان کیا ہے!

دجال کا مادہ "د ج ل" ہے۔ دجل کے لفظی معنی فریب ہیں۔ قرآن کریم میں اس سے ملتے جلتے مفہوم کیلئے لفظ "غرور" استعمال ہوا ہے: **وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ** (الحدید: ۲۰) غرور کے لفظی معنی دھوکہ ہیں۔ لفظ "مغرور" بھی ایسے شخص کیلئے بولا جاتا ہے جو بذاتِ خود اس درجہ قابل اور اہم نہ ہو جس قدر وہ خود کو سمجھے ہوئے ہو۔ اسی طرح دجل کے معنی بھی دھوکے کے ہی ہیں، مگر اس میں دھوکے کا ایک خاص رنگ شامل ہے۔ اسے عام فہم زبان میں سمجھنے کیلئے ہم لفظ "ملمع" ذہن میں لاسکتے ہیں، یعنی کسی اچھی چیز کے دھوکے میں کسی خراب شے کا ہونا، کسی بری یا بدشکل شے پر کسی پرکشش شے کا پردہ ہونا۔ اس نوع کی کیفیت کا نام دجل ہے۔

احادیث مبارکہ میں قربِ قیامت کے دور کی جو علامات ذکر کی گئی ہیں ان میں سے کچھ اسی دجل کے بارے میں ہیں اور اس دور کی دجالی کیفیت کی شدت آشکار کرنے کے لئے اس کو "فتنۂ دجال" کا چونکا دینے والا نام دیا گیا ہے۔ گویا یہ ایک ایسا فتنہ ہوگا جو بظاہر نہایت پرکشش اور عمدہ ہوگا مگر بباطن یہ ایک دھوکہ ہوگا اور اس دلفریبی کے پردے میں درحقیقت کوئی ایسا شدید بگاڑ اور ایسی انتہائی معصیت پنہاں ہوگی جو انسان کیلئے دنیا و

آخرت کے اعتبار سے انتہائی مہلک ہو گی۔

احادیث میں اس فتنہ کے دو مدارج بیان ہوئے ہیں۔ ایک درجہ تو وہ ہے جسے دجالی فتنہ یا دورِ دجالیت کا نام دیا گیا ہے اور اس ضمن میں دورِ دجالیت کی پہچان کیلئے مختلف نشانیاں نہایت صراحت کے ساتھ ذکر کردی گئی ہیں۔ اس فتنہ کا دوسرا یا آخری درجہ وہ ہے جب اس فتنہ کو اپنی آخری حد کو پہنچ کر آخرکار حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ نزول اور نتائج مابعد کی شکل میں دم توڑ دینا ہے۔ اس آخری حد کا ذمہ دار ایک خاص شخص ہو گا۔ روایات میں اس شخص کا لقب، جسے عرفِ عام میں دجالِ اکبر کہا جاتا ہے، "المسیح الدجال" وارد ہوا ہے، یعنی ایسا دھوکے باز شخص جو حضرت مسیحؑ کا پردہ یعنی ان کے نام کا لبادہ اوڑھے گا، بالفاظِ دیگر خود کو مسیحؑ ظاہر کرتے ہوئے انسانیت کو دھوکہ دے گا۔ یہ شخص دراصل یہود میں سے ہو گا۔ اس کی وجہ یہودی مذہب کے جائزے سے واضح ہو جاتی ہے۔ چونکہ توراۃ میں حضرت مسیحؑ کی آمد کی بشارت موجود تھی، جبکہ یہود نے حضرت عیسیٰؑ کو اس بشارت کا مصداق تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا اور وہ اب تک یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو (معاذ اللہ) پھانسی پر لٹکانے میں کامیابی حاصل کرلی تھی، لہٰذا ان کے نزدیک توراۃ کی اس بشارت کے حوالے سے مسیح نے ابھی آنا ہے اور وہ جگہ ابھی خالی ہے۔ اسی جگہ کو پر کرنے کا ڈرامہ رچانے کیلئے یہ شخص آپؑ کے مبارک نام کا لبادہ اوڑھے گا۔ اغلب قیاس یہ ہے کہ یہ شخص جسے احادیث میں "المسیح الدجال" سے موسوم کیا گیا ہے کوئی غیر معمولی سائنس دان یا لیڈر وغیرہ ہو گا اور اس کے پاس غیر معمولی اسلحہ اور عجیب و غریب کرشمے ہوں گے جن کو وہ اپنی سچائی کی دلیل کے طور پر سامنے لائے گا اور یوں ان اختیارات کی مدد سے، جو ان سائنسی کرشموں اور قوتوں کی بنیاد پر اسے حاصل ہو جائیں گے، اہلِ ایمان کو ابتلاء کا شکار بنادے گا۔ قربِ قیامت کے بارے میں مختلف احادیث نبویہؐ کو جمع کرنے اور ان پر غور و تدبر کرنے سے اس شخص "دجالِ اکبر" کے دورِ ظہور وماقبل کا ایک اجمالی سا نقشہ اور ہیولیٰ چشمِ تصور میں ابھرتا ہے۔

احادیث سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وقوعِ قیامت کے قریب کچھ خوفناک جنگیں ہوں گی۔ ان کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں اس قدر شدت اور وسعت کی حامل ہوں گی جن کے سامنے انسانی تاریخ کی سابقہ لڑائیوں اور جنگوں کی ہولناکی اور تباہی ماند پڑ

جائے گی۔ اس کی تائید سورۂ کہف کی ابتدائی آیات سے بھی ہوتی ہے۔ آیت ۲ میں جو لفظ "بَأسًا شَدِيدًا" آیا ہے' مولانا مناظر حسین گیلانیؒ نے اسے انہی جنگوں کی پیش گوئی سے تعبیر کیا ہے اور میرے نزدیک مولانا کی یہ تعبیر صائب ہے' کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ عذابِ اخروی کا ذکر قرآن میں بارہا ہوا ہے مگر اس کے لئے لفظ بأس کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ لہٰذا "بَأسًا شَدِيدًا" کے الفاظ سے محض آخرت کا عذاب مراد لینے سے یہاں اس کی تخصیص کا کوئی جواز نظر نہیں آتا جبکہ دور قربِ قیامت کی جنگوں کا جو خاکہ احادیث کی روشنی میں ابھرتا ہے اور احادیث میں فتنۂ دجال سے محفوظ رہنے کیلئے سورۂ کہف کے التزام کی جو تاکید ملتی ہے اس کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو اس مفہوم اور جواز کی واضح تائید دکھائی دیتی ہے۔

اب آیئے احادیث کی روشنی میں ان جنگوں کا جو خاکہ سامنے آتا ہے اس پر ایک نظر ڈالیں۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کی پہلی جنگ میں مسلمان اور عیسائی ایک تیسری طاقت کے خلاف مجتمع ہوں گے۔ اس تیسری طاقت کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے' لہٰذا اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ یہ کوئی لامذہبی طاقت بھی ہوسکتی ہے یا کسی مذہب کا کوئی "بگڑا ہوا فرقہ" بھی ہوسکتی ہے جو اس علاقے میں یعنی مشرقِ وسطیٰ یا قریبی علاقے میں کسی طرح بااختیار ہوچکی ہو اور آج کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ امر بعید از قیاس نہیں ہے۔ اس تیسری طاقت کے خلاف مسلمان اور عیسائی افواج متحد ہوں گی اور جنگوں کے پہلے مرحلے (Phase) کی ابتداء ہوجائے گی۔ اس جنگ میں بے پناہ خونریزی ہوگی اور بالآخر نتیجہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی متحدہ قوت کی فتح کی صورت میں برآمد ہوگا۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے کی ابتدا ہوگی۔ اس مرحلے کے ذیل میں احادیث سے یوں رہنمائی ملتی ہے کہ تیسری طاقت کے خلاف فتح حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں میں سخت تفرقہ اور اختلافات پیدا ہوں گے جن کے بارے میں مفسرین و شارحین کی رائے یہ ہے کہ ان اختلافات کے بھڑکانے میں یہود کا ہاتھ ہوگا۔ ان اختلافات کے نتیجے میں عیسائی اس فتح کو اپنے مذہب' اپنے عقائد اور اپنی صلیب کی طرف منسوب کریں گے اور اس کو اپنے مذہب کی حقانیت کی دلیل بنائیں گے۔ چنانچہ یہ اتحاد پارہ پارہ ہوجائے گا اور ہوتے ہوتے یہ نااتفاقی اور تفرقہ بالآخر عیسائیوں اور مسلمانوں کے

درمیان مسلح معرکہ آرائی اور ایک شدید جنگ کی صورت اختیار کرے گا جس میں مسلمانوں کو زبردست ہزیمت اور نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔ ترکی' لبنان' شام اور عراق مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائیں گے' حتیٰ کہ عیسائی مسلمانوں کو شکست پر شکست دیتے اور پسپا کرتے ہوئے حجاز میں خیبر کے مقام تک پہنچ جائیں گے۔ قیاس یہ کیا گیا ہے کہ اس جنگ اور اس تمام تر کارروائی میں یہودیوں کی دلی ہمدردیاں اور عملی تعاون عیسائیوں کو حاصل ہوگا۔ ان کا سرمایہ' ان کی ٹیکنیکل مہارت' ان کے کارخانوں میں تیار ہونے والا مہیب و مہلک اسلحہ' ان کے پراپیگنڈہ کے طاقتور ذرائع اور میڈیا' سب عیسائیوں کی پشت پر ہوں گے۔ احادیث کے مطابق یہ وہ مرحلہ ہے جہاں امام مہدی کا ظہور ہونا ہے۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ امام مہدی کی اس شخصیت اور اہلِ تشیع کی مفروضہ و تصوراتی شخصیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سوائے لفظ اور نام کے اشتراک کے کوئی اور چیز مشترک نہیں ہے۔ یہ نام (مہدی) بھی بخاری و مسلم کی مستند روایات میں کہیں منقول نہیں ہے (اس بارے میں تفصیلی جائزہ بعد میں آئے گا' انشاء اللہ) شیعہ مذہب کے لوگ جو اثنا عشری فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ جس مہدی کے ماننے والے ہیں وہ ان کے بارہویں امام ہیں جو ان کے عقیدے کے مطابق غائب ہوگئے تھے اور کسی غار میں مقیم ہیں اور انہوں نے ہی آخری زمانے میں ظاہر ہونا ہے۔ ان کے علاوہ کسی کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ احادیثِ نبویہ سے ہمارے سامنے امام مہدی کی شخصیت اور ان کے ظہور کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک قائد اور رہنما کی حیثیت سے ابھریں گے۔ ان کا نام محمد ہوگا اور ان کے والد کا نام عبداللہ۔ وہ بیت اللہ میں کعبہ کا طواف کر رہے ہوں گے کہ لوگ ان کو پہچانیں گے کہ یہی مہدی موعود ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک آسمانی ندا بھی ان کی نشاندہی کرے گی۔ یعنی وہ خود مہدی ہونے کے دعویدار نہیں ہوں گے بلکہ لوگ انہیں ازخود پہچانیں گے اور کوئی ندائے غیبی اس امر کی تائید کرے گی۔ مسلمان ان کی قیادت میں متحد اور مجتمع ہوں گے۔ مخالف قوتیں ان کے مقابل معجزانہ انداز میں تباہ ہوں گی' جیسے زمین میں دھنس جانا۔ تب مسلمان ان کی قیادت میں عیسائی قوتوں سے جنگ و قتال کریں گے اور ان کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اور شکست پر شکست دیتے ہوئے قسطنطنیہ تک جا پہنچیں گے۔

جب مسلمان قسطنطنیہ کو عیسائیوں کے چنگل سے آزاد کرا رہے ہوں گے تو یک لخت وہ تیسرا مرحلہ شروع ہوگا جسے دجالِ اکبر کے ظہور کا وقت کہا جاتا ہے۔ اس کے ظہور کی خبر اس کے قبضے میں غیر معمولی اسلحہ اور عجیب و غریب کرشمے ہونے کے باعث تمام عالم میں آناً فاناً پھیل جائے گی۔ بعض روایات میں اگرچہ اس کے خروج کی جگہ اصفہان (ایران) بتائی گئی ہے مگر یہ بہرحال طے ہے کہ وہ یہود میں سے ہوگا اور یہودیوں کی مسلح اور بظاہر ناقابل شکست قوت اس کی پشت پر ہوگی۔ وہ پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہوگا۔ عیسائی طاقتیں بھی اس کے ساتھ مل جائیں گی اور مسلمانوں کو شدید ہزیمت و شکست سے دوچار ہونا پڑے گا اور شدید نقصانات اٹھاتے ہوئے امام مہدی کی زیرِ قیادت واپس دمشق کی طرف پلٹیں گے۔ تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی صورت میں اس فتنہ کی حتمی سرکوبی کا وقت شروع ہوگا اور مسیح الدجال کو مسیح الصادق یعنی حضرت عیسیٰؑ قتل کریں گے۔ (اس وقوعِ قتل کے مقام تک کا تعین احادیث میں موجود ہے) اور یوں گویا دجل، صدق کے ہاتھوں حتمی طور پر کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جائے گا۔

اس خاکے کی تفصیل و صراحت، روایات کے حوالوں کے ساتھ انشاء اللہ زمانی ترتیب کے مطابق انہی صفحات میں زیرِ نظر آئے گی۔ فی الحال اس فتنہ کے پہلے درجہ یعنی دورِ دجالیت کا ذکر مناسب ہے۔

جیسا کہ اس اجمالی خاکے کے ذکر سے قبل عرض کیا گیا تھا کہ فتنۂ دجال محض ایک خاص اور معین شخص تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک مکمل فضا اور کیفیت و ماحول کا نام ہے، ایک ایسا ماحول جس کی خصوصیت اور امتیاز دجل ہوگا اور اسی کو سابقہ صفحات میں فتنۂ دجال کا پہلا درجہ بتایا گیا تھا۔ اس سے متعلقہ احادیث کا تتبع کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک خاص دور مراد ہے جس میں کچھ ایسی مخصوص کیفیات وسعت، شدت اور غلبہ حاصل کرلیں گی جن کی زہرناکی کو دجالی فتنہ کا انتباہی نام دیا گیا ہے۔ گویا ظاہری طور پر دلفریب اور پرکشش کیفیت کے درپردہ کچھ ایسی گمراہی ہوگی جو انسان کو اس کے حقیقی مقصدِ تخلیق "عبادتِ رب" یعنی اللہ کی غیر مشروط اور زندگی کے ہر پہلو کے اعتبار سے برضا و رغبت بندگی اور اطاعت سے دور کرتے ہوئے اس کے اخروی ہی نہیں بلکہ دنیوی خسارے کا بھی سامان کرے گی اور چونکہ کشش انگیز ہوگی، جیسا کہ لفظ "دجال" سے اور

متعلقہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے، لہٰذا یہ کیفیت ہمہ گیر بھی ہوگی اور طاقتور بھی۔ اور اس کی یہی وہ شدت و حِدّت اور اہمیت ہے جس کی بناء پر احادیث میں امت کو اس سے خبردار کرنا لازم سمجھا گیا ہے۔

اب آیئے ان احادیث کی روشنی میں اس دور کا سراغ لگائیں جس میں اس کیفیت کے برپا ہونے کی علامات کا ذکر ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ جہاں جہاں "دجال" یا "فتنۂ دجال" کے الفاظ آئیں تو اس سے مراد وہ فضا اور وہ کیفیت ہوگی جو اس دور اور اس خاص ماحول کے ساتھ مخصوص ہے اور جس سے بار بار اور تاکیداً خبردار کیا گیا۔ اس فتنہ کو دجل سے کیوں تعبیر کیا گیا اور اس میں کیا اور کونسا دھوکہ مضمر ہے؟ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ دین کی روح کے مطابق بندۂ مومن کیلئے دنیا ایک گزرگاہ سے زیادہ کی حیثیت کی حامل نہیں ہونی چاہئے۔ قرآن میں بار بار اس دنیا کو دھوکہ دینے والی شے سے تعبیر کیا گیا ہے اور احادیث میں بھی اس کی اسی حیثیت کا بار بار گوناگوں انداز میں اعادہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بندۂ مومن کا اصلی گھر اور اصلی وطن یہ دنیا قطعاً نہیں ہے۔ انسان بلاشبہ کہیں اور سے آیا ہے اور اسے کہیں اور چلے جانا ہے اور یہ دنیا تو اس کا ایک عارضی سا بسیرا ہے لیکن جب یہی دنیا، یہی عارضی بسیرا اس انسان کو اپنے اندر اس قدر محو اور گم کرلے کہ اس کو اپنا اصل گھر اور اپنی حقیقی منزل ہی یاد نہ رہے اور وہ "انا للہ و انا الیہ راجعون" کو فراموش کرتے ہوئے اس عارضی رہ گزر ہی کو اپنا اصل ٹھکانہ سمجھ بیٹھے تو یہی دنیا فی الاصل دجال بن جاتی ہے۔ یہی حقیقت دجل کی ہے۔ اب اگر ایک لحظہ کیلئے یہاں رک کر ہم غور کریں تو یہ خوفناک انکشاف ہوتا ہے کہ مذکورہ ہیبت ناک دورِ دجالیت، جس سے محتاط اور خبردار رہنے کی احادیث مبارکہ میں اس قدر شدت سے تاکید آتی ہے، سے مراد دراصل ہمارا یہ عصرِ حاضر، ہمارا آج کا ترقی یافتہ دور ہی تو ہے۔

موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور سائنسی علوم و فنون کی بالادستی کا دور ہے اور آج پورے کرۂ ارضی پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور دنیا و مافیہا کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح ہمہ گیریت اور غلبہ حاصل کرچکے ہیں جن کی ابتدا تو آج سے تقریباً دو صدیاں پیشتر یورپ میں ہوئی تھی، مگر پھر یہ مسلسل مستحکم ہوتے ہوئے اور پروان

چڑھتے ہوئے تقریباً تمام کرۂ ارض کا احاطہ کر چکے ہیں۔ ان تصورات اور نظریات کی ہمہ گیریت اور پھیلاؤ پر نظر ڈالنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ان کا بنیادی نقطۂ نظر سمجھ لیا جائے تاکہ اس کا دجل واضح طور پر سامنے آسکے۔ تہذیبِ جدید کی بنیاد میں جو فکر کام کر رہا ہے وہ نہ تو کوئی ایک روز میں نمودار ہوا اور نہ ہی کوئی سادہ اور بسیط سی شے ہے بلکہ ان ڈیڑھ دو سو برسوں میں جب یہ تصورات ارتقاء پذیر ہوئے' جانے کتنے ہی مکاتبِ فکر و فلسفہ یورپ میں پیدا ہوئے اور کتنے ہی زاویہ ہائے نگاہ سے انسان نے اپنی زندگی اور اس کے متعلقات پر غور و تدبر کیا' لیکن اس پورے ذہنی سفر میں ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی بیک وقت اساس اور ماحصل قرار دیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خیالی اور "ماورائی" تصورات کی بجائے ٹھوس حقائق اور واقعات کو غور و فکر اور سوچ بچار کا اصل مرکز و محور ہونے کی حیثیت حاصل ہوئی اور خدا کی بجائے کائنات' روح کی بجائے مادہ اور حیات بعد الموت کی بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ جستجو اور نقطۂ ارتکازِ توجہ قرار دے دیا گیا۔ خالص علمی سطح پر تو اگرچہ یہی کہا گیا کہ ہم خدا' روح اور حیات بعد الموت کا نہ تو اقرار کرتے ہیں نہ انکار مگر بین السطور اس کی حقیقت یہی تھی کہ یہ سب لایعنی باتیں ہیں اور ان لغو و بے سروپا باتوں کیلئے ہماری بحث میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ تصورات رفتہ رفتہ بالکل خارج از بحث ہوتے چلے گئے اور آج یہ صورت حال ہے کہ انسان کے سارے غور و فکر اور تحقیق و تجسس کا مرکز و محور کائنات' مادہ اور حیاتِ دنیوی بن کر رہ گئے ہیں اور اس صورتِ حال کے پھیلاؤ کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ ہرچند کہ آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے کتنے ہی حصوں میں منقسم ہے مگر بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات کو چھوڑ کر تقریباً ایک ہی طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور ایک ہی تہذیب کا سلسلہ اور ایک ہی تمدن کی جھلک پوری دنیا میں رواں ہے۔ کہیں کہیں منتشر طور پر کوئی دوسرا نقطۂ نظر اور طرزِ نگاہ اگر پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زندگی کی اصل شاہراہ سے ہٹی ہوئی پگڈنڈی سے زیادہ نہیں' ورنہ مشرق ہو یا مغرب' ہر جگہ وہ طبقے جو قیادت و سیادت کے مالک ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ متضمنات کی اصل زمامِ کار ہے وہ سب کے سب بلا استثناء اسی ایک ہی رنگ میں رنگے

ہوئے ہیں۔ دین و ایمان سے بے رغبتی اور بیزاری پر مبنی اس تہذیب و تمدن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلط اور غلبہ اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بعض ان قوتوں کے نقطۂ نظر اور ماحولِ دورن خانہ کا جائزہ بھی اگر دقتِ نظر سے لے لیا جائے جو مختلف ممالک میں اس تہذیب کے خلاف بظاہر صف آرا ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس تہذیب کے اثرات سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہیں اور خود ان کا انفرادی اور اجتماعی طرزِ فکر و عمل بہت حد تک ویسا ہی ہے جیسا کہ اس تہذیب اور اس کلچر کی "ہدایات" ہیں۔ آج دنیا میں یہ تہذیب' یہ مادیت پرستی کی سوچ' ظاہر بین نگاہ کا فتراک اس شدت تک پہنچ چکا ہے جس کو دجل کہا گیا ہے۔ سائنسی ترقی کی وجہ سے دنیا کی رنگینیوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کشش سے متاثر انسان اس کے پیچھے باؤلا ہو رہا ہے۔ گویا اسی بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ دنیوی زندگی دراصل اس وقت دجل بن جاتی ہے جب یہ مقصود و مطلوب و محبوبِ حقیقی بن جائے اور اگر اس کی دلکشی' رعنائی اور کشش انگیزی سے مسحور ہوئے بغیر انسان دنیوی اسباب و ذرائع کو پوری طرح استعمال کرتے ہوئے بھی اس کی حیثیت اپنے دل میں محض ایک رہ گزر سے بلند تر نہ ہونے دے تو اس کی تمامتر دیدہ زیبی اور حسن و سحر آفرینی فی نفسہٖ دجالیت کے دائرے میں قطعاً نہیں آسکتی۔ قرآن حکیم میں دنیا کو "متاع" یعنی برتنے کا سامان قرار دیا گیا ہے۔ دینِ اسلام میں رہبانیت کی تعلیم نہیں ہے اور یہ دنیا سے کنارہ کشی کی تلقین قطعاً نہیں کرتا۔ تلقین صرف اتنی ہے کہ اس کو وہ حیثیت نہ دو جس سے یہ مطلوب و مقصود و محبوبِ حقیقی بن جائے۔ حدیث نبوی ہے: **اَلدُّنیَا مَزرَعَۃُ الاٰخِرَۃِ** یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے' جو یہاں بوؤ گے وہی آگے کاٹو گے چنانچہ اگر اس زندگی کو حقیقت میں دارالامتحان سمجھ لیا جائے تو سمجھئے کہ اس کی تمام تر رعنائی اور سحر طرازی کے فسوں کا پردہ چاک ہو گیا اور اس کی دجالیت ختم ہو گئی۔

اس فتنہ کی نوعیت' ہمہ گیریت اور شدت و تسلط کے بارے میں تفصیلی جائزہ اسی موضوع کے ضمن میں انشاء اللہ حسبِ ترتیب سامنے آتا رہے گا' یہاں ان احادیث پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جو اس فتنہ کے ضمن میں اور بالواسطہ طور پر قربِ قیامت کے دور کی علامات کے طور پر زبانِ رسالت ؐ سے عطا ہوئی ہیں۔

(جاری ہے)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خطبۂ خلافت

نظری و عملی سیاست کا منشور

از: محمد شکیل صدیقی' استاذ شعبہ اسلامی تاریخ ، جامعہ کراچی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد' اسی روز سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار و مہاجرین جمع ہوئے اور جانشینی کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال اور غور و فکر کیا۔ بحث و تمحیص کے بعد اہلِ مجلس نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کے بعد دوسرے روز مسجد نبویؐ میں ایک اجلاسِ عام منعقد ہوا اور مسلمانانِ مدینہ نے " سقیفہ " کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے دوبارہ حضرت ابوبکر صدیقؓ پر اپنے اعتماد کا ووٹ دیا اور انہیں اپنا دینی و سیاسی قائد اور خلیفہ منتخب کرلیا۔ اس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور پہلے خلیفہ قرار پائے --- بیعتِ عام کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے منبرِ خلافت سے امتِ مسلمہ سے پہلا خطاب فرمایا۔ آپؓ کا یہ پہلا خطاب تاریخ میں " خطبۂ خلافت " سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آپؓ نے خطبۂ خلافت دیتے ہوئے فرمایا:

> " لوگو! میں آپ پر حکمران بنایا گیا ہوں حالانکہ میں آپ سب میں سے بہتر نہیں ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے میں نے یہ منصب اپنی مرضی اور خواہش سے حاصل نہیں کیا' نہ میں یہ چاہتا تھا کہ کسی دوسرے کی بجائے مجھے مل جائے' نہ میں نے کبھی خدا سے اس کے لئے دعا کی' نہ کبھی میرے دل میں اس کے لئے حرص پیدا ہوئی۔ میں نے تو بادلِ نخواستہ اس لئے قبول کیا ہے کہ مجھے مسلمانوں میں فتنۂ اختلاف اور عرب میں فتنۂ ارتداد برپا ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ میرے لئے اس منصب میں کوئی راحت نہیں ہے بلکہ یہ ایک عظیم بار ہے جو مجھ پر ڈال دیا گیا ہے جس کے اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہیں

ہے' الا یہ کہ اللہ ہی میری مدد فرمائے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میرے بجائے کوئی اور یہ بار اٹھالے۔ اب بھی اگر آپ لوگ یہ چاہیں تو اصحابِ رسول اللہؐ میں سے کسی اور کو اس کام کے لئے چن لیں' میری بیعت آپ کے راستے میں حائل نہ ہوگی۔ آپ لوگ اگر مجھے رسول اللہؐ کے معیار پر جانچیں گے اور مجھ سے وہ توقعات رکھیں گے جو حضورؐ سے آپ رکھتے تھے تو میں اس کی طاقت نہیں رکھتا' کیونکہ وہ شیطان سے محفوظ تھے اور ان پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی۔ اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کیجئے' اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دیجئے! سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ تمہارے درمیان جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے' یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلواؤں اگر خدا چاہے' اور تم میں سے جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے' یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کروں اگر خدا چاہے۔ جو قوم اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چھوڑ دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ذلت میں مبتلا کر دیتا ہے اور جس قوم میں فواحش پھیل جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر مصائب نازل فرمادیتا ہے۔ میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کروں۔ اگر میں اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ اٹھو نماز پڑھو' اللہ تم پر رحم فرمائے!"

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ خطبہ معمولی رد و بدل کے ساتھ تاریخ کی تمام اہم اور مستند کتابوں مثلاً علامہ ابنِ جریر طبری کی تاریخ الامم و الملوک' ابنِ کثیر کی البدایہ و النہایہ' ابنِ ہشام کی السیرۃ النبویہ' شیخ علی المتقی کی کنز العمال اور ابنِ سعد کی طبقات میں مذکور ہے۔

اس خطبے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسلام کے بنیادی اصولوں اور سیرت نبویؐ کی پیروی کرتے ہوئے نظری اور عملی سیاست کا وہ نقشہ پیش کیا ہے جسے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ میں ہمیشہ ایک نمونہ اور مثال کی حیثیت حاصل رہی ہے اور یہ آج بھی اسلامی سیاست کا بہترین نقیب ہے۔ آپؓ کے اس خطبہ میں اسلامی سیاست و حکومت کے جو اصول ہمیں ملتے ہیں ان میں پہلا اصول "منصبِ خلافت یا عہدۂ حکومت کا تصور" ہے۔

اسلامی نظریۂ حکومت و سیاست میں اقتدار یا حکومت کے کسی منصب کا تصور غیر اسلامی نظریۂ سیاست و حکومت سے مختلف ہے۔ غیر اسلامی طرزِ حکومت و سیاست کی بنیاد مسندِ اقتدار اور مناصبِ حکومت کی طلب اور ہوس و حرص پر قائم ہے۔ مسندِ اقتدار اور عہدۂ حکومت کو عوام کے حقوق اور خدمت کے نام پر ذاتی جاہ و شرف اور مادی مفادات کے حصول کا زینہ بنایا جاتا ہے اور حصولِ مناصب اور اقتدار کے لئے دولت و طاقت کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے۔ سیاست کی منڈی میں ووٹوں کی بولی لگائی جاتی ہے' دروغ گوئی اور جھوٹے پروپیگنڈہ کے ذریعے حقائق کو مسخ کر کے عوام کو گمراہ کیا جاتا ہے' الزام اور بہتان تراشی کا دست دراز کر کے عزت و ناموس کے پیرہن کو تار تار کیا جاتا ہے۔ حصولِ مناصب کا یہ مذموم طریقہ اور تصور تیسری دنیا کی سیاست ہی میں نہیں بلکہ جدید اور مہذب دنیا کے دعویداروں کی سیاست میں بھی رائج اور مستعمل ہے اور اس کی تازہ مثال امریکہ سے حالیہ صدارتی انتخاب کی مہم ہے جس میں صدارتی امیدواروں نے ایک دوسرے پر سنگین نوعیت کے الزامات عائد کئے اور بلیک میلنگ کے طریقے کو اختیار کیا ـــــ ظاہر ہے کہ مسندِ اقتدار اور مناصبِ حکومت کے حصول کے اس تصور اور طریق پر قائم ہونے والی حکومت و سیاست ' خدمت ' اخلاص ' انصاف ' امن اور آزادی کی جملہ صفات اور ذمہ داری اور جواب دہی کے احساسات سے محروم ہوگی اور اس کی جگہ خود غرضی ' بے ایمانی ' بد عنوانی ' بے چینی ' بے یقینی اور مطلق العنانی کی پروردہ سیاست و حکومت جنم لے گی۔ غیر اسلامی طرزِ حکومت و سیاست میں مسندِ اقتدار کی ہوس ' تمنا اور خواہش اور ذاتی مقاصد کے لئے مناصبِ حکومت کے حصول کی جدوجہد کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کیا جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کی عار محسوس نہیں کی جاتی بلکہ غیر اسلامی طرزِ سیاست و حکومت کا یہی طریقہ اہلیت کا معیار (Qualification) قرار پاتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام میں مسندِ اقتدار یا مناصبِ حکومت مجرد عہدہ یا منصب نہیں' بلکہ یہ ایک ذمہ داری اور امانت ہے اور اس کی طلب و حرص ممنوع ہی نہیں بلکہ اسلامی طرزِ حکومت و سیاست میں سب سے بڑی نا اہلی (Disqualification) ہے۔ کتاب اللہ اور رسول اللہ ؐ نے اقتدار اور مناصبِ حکومت کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی رُو سے

حکومت کا طالب خائن ہے اور ایسا شخص اسلامی حکومت کا عامل نہیں بنایا جاسکتا اور ایسا فرد خدا کی مدد اور استعانت سے محروم ہوگا۔ از روئے:

اِنَّ اَخوَنکُم عِندَنَا مَن طَلَبَہٗ

"تم میں سب سے بڑھ کر خائن ہمارے نزدیک وہ ہے جو اسے خود طلب کرے"

اِنَّا لَا نَستَعمِلُ عَلٰی عَمَلِنَا مَن اَرَادَہٗ"

" ہم اپنی حکومت میں کسی ایسے شخص کو عامل نہیں بناتے جو اس کی خواہش کرے۔"

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے عبدالرحمٰن بن سمرہ! امارت کے طالب نہ بنو، اگر یہ بن مانگے تمہیں ملی تو اس کام میں خدا کی طرف سے تمہاری مدد کی جائیگی اور اگر اس کو مانگ کر لوگے تو تم اس کے حوالے کردیے جاؤ گے۔"

اسی سلسلے کی ایک اور روایت حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"جو شخص اس بات کا طالب ہوتا ہے کہ اس کو قاضی بنایا جائے، اس کو اسی کے نفس کے حوالے کردیا جاتا ہے اور جو شخص اس عہدے کو قبول کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے، اس پر ایک فرشتہ اترتا ہے جو اس کی رہنمائی کرتا ہے۔"

سورۂ قصص میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان لوگوں کیلئے آخرت میں جنت کو مخصوص کرنے کا وعدہ کیا ہے جو نہ تو دنیا میں بڑائی کے طالب ہیں اور نہ ہی فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام میں منصب کا یہ وہ تصور اور احساس ہے جس کی پیروی کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے قول و عمل سے اس کا اظہار پہلے سقیفہ بنی ساعدہ میں اور بعد میں مسجد نبویؐ کے اجلاسِ عام میں کیا۔ مناصبِ حکومت کا یہ تصور اسلامی حکومت، سیاست کی عمارت کی خشتِ اول ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسلامی حکومت و سیاست کا دوسرا اصول احتساب و تنقید کو قرار دیا۔ احتساب و تنقید اسلام کے سیاسی نظام کی روح اور زندگی ہے، لیکن اسلامی سیاست میں احتساب و تنقید کا تصور بھی رائج الوقت سیاست سے مختلف ہے۔ رائج الوقت سیاست میں ایک مخصوص گروہ احتساب و تنقید کا ٹھیکیدار ہوتا ہے جسے حزبِ

اختلاف (اپوزیشن) کہا جاتا ہے۔ یہ اپوزیشن حکمرانوں اور حکومت کو ملعون و مطعون کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ اس مخصوص گروہ کی سیاست صرف مخالفت برائے مخالفت اور تنقید برائے تنقید اور دشنام طرازی پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی سیاست میں نہ ایسی کسی اپوزیشن (حزبِ اختلاف) کا تصور ہے اور نہ ہی احتساب و تنقید کا' بلکہ اسلامی سیاست میں احتساب و تنقید پوری امت کی ذمہ داری اور حق ہوتا ہے جو نصیحت اور خیر خواہی کے اصول اور جذبے کے تحت کی جاتی ہے۔ ایک اسلامی حکومت میں یہ امت کی ذمہ داری ہے کہ جب وہ خلیفہ یا امیر کو راہِ راست سے ہٹا ہوا دیکھیں تو خیر خواہی کے جذبہ کے تحت اسے تنبیہہ کریں' اس لئے کہ سارے معاملات کی بنیاد ایک دوسرے کے لئے خیر خواہانہ جذبے پر ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ وہ خلیفہ یا امیر کبھی راہِ راست سے بھٹک نہیں سکتا جس کی پشت پر پوری قوم ہو اور جس کے دل میں اسے راہِ راست پر رکھنے اور آگے بڑھانے کا جذبہ موجزن ہو۔ خلیفہ یا حکومت کا احتساب اور تنقید نہ صرف اسے راہِ راست پر رکھتا ہے بلکہ امت میں امورِ حکومت میں شراکت کا احساس پیدا کرتا ہے اور اگر خلیفہ یا امیر اس جذبہ کی ترغیب امت کو نہ دیں تو پھر احساسِ محرومی اور امورِ مملکت سے لاتعلقی جنم لیتی ہے جس کی وجہ سے نظامِ سیاست و حکومت کمزور اور انتشار کا شکار ہوجاتا ہے ـــــ احتساب اور تنقید دراصل جمہوریت اور شورائیت کی روح اور مستحکم اسلامی نظامِ حکومت و سیاست کی کلید ہے جسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی امت کو تفویض کیا اور اس طرح آپ نے جمہوریت اور شورائیت کی بالادستی قائم کی۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے خطبۂ خلافت میں اسلامی حکومت یا خلیفہ کی اتباع و اطاعت کی نوعیت اور اصول و شرائط کی بھی وضاحت کی اور فرمایا کہ:

أَطِيعُونِي مَا أَطَعْتُ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَإِذَا عَصَيْتُ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَلَا طَاعَةَ لِي عَلَيْكُمْ۔

"میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہوں اور جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے"

اسلامی حکومت میں خلیفۃ المسلمین کی اطاعت شرعًا واجب ہے وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (النساء: ۵۹) اور اس کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مترادف قرار دیا ہے، مگر یہ اطاعت غیر مشروط نہیں ہے، بلکہ اسلام نے اس کے ساتھ کڑی شرائط عائد کی ہیں اور وہ اساسی شرط یہ ہے کہ خلیفۃ المسلمین کی اطاعت صرف معروف میں واجب ہے اور اگر وہ کسی معصیت کے کام کا حکم دے تو ایسی حالت میں اس کی اطاعت لازم نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا طَاعَۃَ فِی مَعْصِیَۃِ اللّٰہِ اِنَّمَا الطَّاعَۃُ فِی الْمَعْرُوْفِ

"اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں، اطاعت صرف معروف میں ہے۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اطاعت کے اسی اسلامی اصول کی پیروی کی اور انہوں نے خلیفہ اور مختارِ مطلق ہوتے ہوئے بھی اپنی خلافت کو اللہ اور رسولؐ کی حکمرانی کے تابع رکھا اور لوگوں سے تعاون کی اپیل کی اور آپؓ نے اعلان و اقرار کیا کہ جب تک وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے خلاف نہ چلیں اس وقت تک ان کی اطاعت کی جائے۔ اس طرح حکومت و سیاست میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حریتِ فکر کے اصول کی حوصلہ افزائی کی جو آج کی متمدن دنیا میں ناپید ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عدل کو خلیفہ کا فرض، ذمہ داری اور خلافت کا ایک بنیادی مقصد قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:

وَ الضَّعِیْفُ فِیْکُمْ قَوِیٌّ عِنْدِیْ حَتّٰی اُرِیْحَ عَلَیْہِ حَقَّہٗ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ وَ الْقَوِیُّ فِیْکُمْ ضَعِیْفٌ عِنْدِیْ حَتّٰی اٰخُذَ الْحَقَّ مِنْہُ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ

"تم میں سے قوی ترین شخص میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک کہ اس کے لئے اس کا حق حاصل نہ کرلوں اور تم میں سے کمزور ترین شخص میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ اس سے حق نہ لے لوں"

اس خطبے میں آپؓ نے حکومت و سیاست میں قیامِ عدل کے جس تصور کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ خلیفہ اور حکومت کی قوت ظالموں اور غاصبوں کے مقابلے میں مظلوموں اور کمزوروں کی پشتیبان ہوگی اور خلیفہ کے نزدیک آدمی کے ضعف و قوت کا انحصار اس کے مالی و سائل کی کمی و بیشی، اس کے خاندان کی شرافت و رذالت اور

حکومت کے اندر رسائی اور نارسائی پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ حق پر ہے یا باطل پر۔ عدل کا یہ وہ معیاری تصور ہے جس پر اسلامی نظامِ حکومت و سیاست کی پرشکوہ عمارت قائم رہ سکتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عدل کے اسی اسلامی تصور کو پیش کیا اور یہی سیاستِ عادلہ ہے جس کے ذریعہ مظلوم کو ظالم و فاجر سے اس کا حق دلایا جاتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے خطبۂ خلافت میں امت کی اصلاح و رہنمائی کا وہ اصول و ضابطہ بھی پیش کیا ہے جو اس کی عظمت اور ترقی کی بنیاد اور دنیا و آخرت میں نجات کا ذریعہ ہے اور یہی سیاستِ عادلہ' سیاستِ شرعیہ کا مقصود ہے۔

ذیل میں ہم خطبہ کے ان پہلوؤں کا ذکر کریں گے جن کا تعلق اخلاقی تعلیم' معاشرتی اصلاح اور ملتِ اسلامیہ کی عظمت و ترقی کے اصول وضوابط سے ہے۔

(۱) آپؓ نے اپنے خطبہ میں اخلاقی تعلیم کے حوالے سے فرمایا کہ "سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔" سچائی کی اچھائی اور جھوٹ کی برائی مسلمات میں سے ہے۔ انسان کے ہر قول اور درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کا دل اور زبان ایک دوسرے کے مطابق اور ہم آہنگ ہوں' اسی کا نام صدق یا سچائی ہے۔ جو سچا نہیں' اس کا دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے اور جو سچا ہے اس کے لئے ہر نیکی کے حصول راستہ آسان ہے' لیکن سچائی اور جھوٹ کا جو اساسی مفہوم اس خطبے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پیشِ نظر ہے وہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ آپؓ کے نزدیک سچائی سے مراد خدا کی شریعت یا کتاب ہے اور جو سچا اور امانت دار ہے وہ خدا کی شریعت اور اس کی کتاب کا پیروکار بھی ہے اور یہی امانت داری ہے کہ جو بات خدا اور اس کا رسولؐ پیش کرے اسے قبول کرے اور عمل کرے۔

(۲) معاشرتی اصلاح کے حوالے سے آپؓ نے امت کو خبردار کیا کہ "جس قوم میں فواحش پھیل جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر مصائب نازل فرمادیتا ہے۔ فواحش کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں قبیح ہو فحش ہے' مثلاً بخل' زنا' برہنگی و عریانی' عمل قوم لوط' محرمات سے نکاح کرنا' چوری' شراب نوشی' بھیک مانگنا' گالیاں بکنا' اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے' مثلاً جھوٹا پروپیگنڈہ' تہمت تراشی' پوشیدہ جرائم کی تشہیر' بدکاریوں پر

ابھارنے والے افسانے، ڈرامے اور فلم، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظرِ عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا وغیرہ —— یہ فواحش وہ برائیاں ہیں جو انفرادی حیثیت سے افراد کو اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کر دیتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اخلاقی و معاشرتی اصلاح پر مبنی جو سیاسی پروگرام اپنے خطبہ میں پیش کیا اس پر پوری طرح عمل کر کے دکھایا۔ آپؓ کے عہدِ خلافت میں معاشرہ حق و صداقت کا علمبردار اور ہر طرح کے فواحش سے پاک رہا۔ آج ایسے ہی سیاسی پروگرام کی ضرورت ہے اور ملتِ اسلامیہ کے رہنماؤں اور سیاستدانوں کے لئے لمحہ فکریہ بھی ہے کہ وہ اپنے اپنے معاشروں کو، جہاں سچائی ناپید اور فواحش کا سیلاب رواں دواں ہے اور اسلامی اقدار کو تباہ کر رہا ہے، کیا کر رہے ہیں؟ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ملتِ اسلامیہ پر مصائب اور ابتلاء جھوٹ اور فواحش کا نتیجہ ہے اور ان مصائب اور ابتلاء سے نکلنے کا وہی راستہ ہے جس کی طرف خلیفۂ اول نے نشاندہی کی ہے۔ یعنی جھوٹ اور فواحش سے اجتناب۔

(۳) حضرت ابوبکرؓ نے خطبۂ خلافت میں امت کو ترکِ جہاد کے نتائج سے خبردار کیا اور کہا کہ "جو قوم اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چھوڑ دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ذلت میں مبتلا کر دیتا ہے۔" اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے اسلامی حکومت کے دشمنوں سے جنگ کو جہاد کہتے ہیں۔ مسلمانوں پر جہاد فرض ہے اور جہاد سے پیچھے رہنا اور اس سے گریز کرنا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: **اِلَّا تَنۡفِرُوۡا یُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا** (التوبہ ۳۹)۔ "اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تمہیں دردناک عذاب دے گا۔" اسی طرح فرضیتِ جہاد کے بارے میں احادیث بھی مروی ہیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتحِ مکہ کے موقع پر فرمایا:

> "فتح کے بعد ہجرت نہیں، البتہ جہاد اور نیت ہے، اس لئے جب تمہیں جہاد کے لئے روانگی کا حکم ملے تو روانہ ہو جاؤ" (بخاری کتاب الجہاد)

جہاد کا مقصد اعلائے کلمۃ الحق اور بلادِ مفتوحہ کے لوگوں میں حق و عدل پھیلانا ہے اور زیادہ جامع الفاظ میں مقصدِ جہاد یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو ظلم و ستم کے اندھیروں اور فکر و عمل کی گمراہیوں سے نجات دلائی جائے۔ دراصل جہاد ہی وہ مہتم بالشان فریضۂ ملی

ہے جو نہ صرف نظامِ ملت کے قیام اور بقاء و استحکام کے لئے بلکہ فلاحِ انسانیت کے لیے از بس ضروری ہے۔ اسی بناء پر اسلام میں جہاد کو جو عظیم الشان مرتبہ حاصل ہے وہ دوسرے اعمال کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اسی عمل کو مسلمانوں کے لئے ذریعۂ نجات قرار دیا ہے:

"کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ اب تک اللہ تعالیٰ نے تم میں جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو ممیز نہیں کیا" (آلِ عمران)

ملتِ اسلامیہ کی حیاتِ اجتماعیہ کی روح جہاد ہے۔ جس طرح جسم کی حس و حرکت روح کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اسی طرح جسدِ ملت کی زندگی اور اس کی نشو و نما جہاد کے سوا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ترکِ جہاد کو ہلاکت سے تعبیر کیا ہے:

"اگر تم جہاد کے لئے نہ نکلو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو اٹھائے گا اور تم خدا کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے" (التوبہ:۳۹)

"تم اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو" (البقرہ:۱۹۵)

ابنِ عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپؐ نے فرمایا:

" جب لوگ درہم و دینار کے حریص ہوجائیں اور جنسیں بازار میں آنے سے پہلے ہی بیع کرنے لگیں اور بیلوں کی دمیں پکڑ لیں (یعنی کھیتی باڑی میں منہمک ہوجائیں اور جہاد کو چھوڑ دیں تو اللہ تعالیٰ ان پر سخت آزمائش مسلط کرے گا اور وہ اس سے اس وقت تک نہ نکل سکیں گے جب تک اپنے دین کی طرف نہ لوٹ کر آئیں گے (یعنی جہاد کو قائم نہ کریں گے)"

قرآن اور حدیث میں ترکِ جہاد کو وجہ ہلاکت اور ابتلاء و آزمائش اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ خدائے قدوس نے امتِ مسلمہ کو ایک بلند تر مقصد کے لئے چنا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے سرفروشانہ جدوجہد کرنا اس کی حیاتِ اجتماعیہ کا طغرائے امتیاز ہے، یعنی ملتِ اسلامیہ کے قومی تشخص اور ہیئتِ ملی کے قیام اور بقاء کا انحصار جہاد پر ہے۔

اور اس کے سوا دنیا میں امتِ مسلمہ کا حقیقی وجود نہیں ہے۔

آج عالمِ اسلام خوف و رجاء، امید و بیم اور جن اندوہناک مصائب و آلام سے دوچار ہے اس کا سبب سوائے ترکِ جہاد کے اور کیا ہے؟ ترکِ جہاد ہی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمانانِ عالم تعداد، جغرافیائی محلِ وقوع اور قدرتی ذرائعِ پیدا وار کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہونے کے باوجود ہنود و یہود کے مقابلے میں ان کا سیاسی موقف اور ملی شعور کس قدر کمزور ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب تک مسلمان جذبۂ جہاد سے سرشار اور میدانِ جہاد میں سرگرم عمل رہے اسلام کا پھریرا سارے جہاں میں لہراتا رہا۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے خطبۂ خلافت میں ترکِ جہاد کے مضمرات کی طرف اسی لئے متوجہ کیا اور زور دیا کہ اگر وہ ہلاکت اور ابتلاء و آزمائش سے بچنا چاہتے ہیں اور دنیا و آخرت میں نجات چاہتے ہیں تو جہاد کا راستہ ترک کرنے کی بجائے جہاد سے اپنا رشتہ مضبوط کریں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ڈھائی سالہ عہدِ خلافت جہاد فی سبیل اللہ کی تاریخ ہے اور آپؓ نے جہاد کے جس جذبہ کو مہمیز دی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ آئندہ مسلمانوں کی عظمت اور ترقی کا بول بالا ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے خطبۂ خلافت میں سیاست و ریاست کے جن اصولوں کو پیش کیا ہے وہ اسلام اور اسلامی سیاست کا اصول، ضابطہ اور منشور ہے اور حال اور مستقبل کی سیاست کی اصلاح و ترقی کے لئے یہ خطبۂ خلافت اہلِ سیاست و حکومت کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

کتابیات

(۱) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، مصر ۱۹۳۶ء

(۲) ابن کثیر، عماد الدین ابی الفداء اسماعیل، البدایہ والنہایہ، بیروت ۱۹۶۶ء

(۳) طبری، ابو جعفر محمد ابن جریر، تاریخ الرسل والملوک، مصر ۱۹۶۰ء

(۴) مودودی، ابوالاعلیٰ، خلافت و ملوکیت، لاہور ۱۹۸۲ء

(۵) ابن سعد، الطبقات، الکبرا، بیروت، ۱۹۶۰ء

(۶) اصلاحی، امین احسن، اسلامی ریاست، لاہور۔

مدحِ عمرؓ بزبانِ صدیق اکبرؓ

مشہور قول "لا یصلح آخر ھذہ الامۃ ..." کی تحقیق کے ضمن میں مدیرِ فیض' جناب قاضی محمد حمید فضلی کا مکتوب

محترم جناب ڈاکٹر صاحب! زید معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

میثاق فروری ۸۶ء کے شمارہ میں افکار و آراء کے ذیل میں عزیزی شمس مجددی صاحب کے مکتوب سے خوشی ہوئی کہ انہوں نے آپ کے خطاب میں بالواسطہ اس عاجز کو بھی اپنے ایک مقالہ میں "لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بھا اولھا" کو حضور علیہ السلام کی طرف منسوب کرنے پر تنبیہ کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے میں اس سہو کو معاف فرمائے۔ یہ عاجز جب ماہنامہ "فیض" کے "عشاقِ رسول نمبر" کے سلسلہ میں سرخیلِ محبّین حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات کے تفحص کے لیے متعلقہ کتب کی طرف متوجہ ہوا تو یہ کلمات آپؓ کے ایامِ مرضِ موت کے آخری خطبہ میں ملے جو آپؓ نے حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرنے پر بعض صحابہؓ کی طرف سے ان کی شدتِ طبع پر تشویش کے اظہار کے جواب میں دیا تھا، جسے "کنز العمال" ص۱۴۷ ج ۳ اور اسی طرح "کنز العمال" کے حوالہ سے "حیات الصحابہ" عربی ص۲۴، ۲۵، ج ۲ (ہمارے پاس "حیات الصحابہ" کا جو ایڈیشن موجود ہے وہ دہلی کا مطبوعہ ہے۔ اس میں یہ خطبہ ص۲۷، ۲۸ ج ۲ پر ہے) میں حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی (امیرِ تبلیغی جماعت رحمہ اللہ تعالیٰ) نے بھی "من یحتمل الخلافۃ" کے عنوان سے ذکر فرمایا، جو یہ ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اُحْذُرُوا الدُّنْيَا وَلَا تَثِقُوْا بِهَا، (فَاِنَّهَا) غَرَارَةٌ وَآثِرُوا الْاٰخِرَةَ عَلَى الدُّنْيَا فَاَحِبُّوْهَا فَبِحُبِّ كُلِّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُمَا تُبْغَضُ الْاُخْرٰى وَاِنَّ هٰذَا الْاَمْرَ الَّذِيْ هُوَ اَمْلَكُ بِنَا لَا يَصْلُحُ آخِرُهُ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهِ اَوَّلُهُ فَلَا يَحْمِلُهُ اِلَّا اَفْضَلُكُمْ مَقْدِرَةً وَاَمْلَكُكُمْ لِنَفْسِهِ اَشَدُّكُمْ فِيْ حَالِ الشِّدَّةِ وَاَسْلَسُكُمْ فِيْ حَالِ الشِّدَّةِ وَاَعْلَمُكُمْ بِرَاْيِ ذَوِي الرَّاْيِ

لَا يَتَشَاغَلُ بِهَا بِمَا لَا يَعْنِيهِ وَلَا يَحْزَنُ بِمَا لَا يَعْزِلُ بِهِ وَلَا يَسْتَحِي مِنَ التَّعَلُّمِ وَلَا يَتَحَيَّرُ عِنْدَ الْبَدِيهَةِ، قَوِيٌّ عَلَى الْأَحْوَالِ، وَلَا يَخُونُ بِشَيْءٍ مِنْهَا حِدَّةً لِعُدْوَانٍ وَلَا يَقْصُرُ وَيَرْصُدُ بِمَا هُوَ آتٍ عِتَادَهُ مِنَ الْحَذَرِ وَالطَّاعَةِ وَهُوَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ

"اے لوگو! دنیا سے ڈرو اور اس پر بھروسہ مت کرو، یہ دھوکہ باز ہے، آخرت کو دنیا پر ترجیح دو اور اُسے پسند کرو کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی محبت دوسری سے نفرت کا باعث ہوتی ہے۔ یہ معاملہ جو اس وقت ہمارے لیے انتہائی اہم ہے اس کا آخر اس چیز سے اصلاح پذیر ہو سکتا ہے جس سے اس کے اول نے اصلاح پائی اور اس کی برداشت اور اس ذمہ داری کو وہی شخص نباہ سکتا ہے جو تم میں طاقت و مقدرت کے لحاظ سے بہتر ہو، جو ضبطِ نفس کے لحاظ سے پختہ تر ہو اور کسی بھی سختی کے وقت تاثر نہ لینے میں وہ سخت ہو، یعنی اعصابی لحاظ سے مضبوط ہو اور نرمی کے زمانہ میں وہ خوش مزاج ہو، مردم شناس ہو، اپنے اردگرد خوشامدی ٹولے سے زیادہ عقل مندوں کو ترجیح دیتا ہو، جس کے اوقات تعمیری ہوں اور جو اندیشہ ہائے فردا سے غم حال کی تعمیر میں منہمک ہو، اور جو کسی سے حصولِ علم میں حیا نہ محسوس کرتا ہو، جو اچانک حادثات میں ڈانواڈول نہ ہوتا ہو، جو معاشی استحکام کا ذہن رکھتا ہو، اپنے غصہ کی سرکشی و ظلم میں قومی دولت کی خیانت و تقصیر کا مرتکب نہ ہوتا ہو، اس کے ذہن میں سفرِ آخرت کی تیاری کے سامان کا خیال رہتا ہو — جو اللہ کا ڈر اور اس کی اطاعت ہے — ان صفات کا حامل عمر بن الخطاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے:"

یہ عاجز مناسب موقع پر تلاش میں تھا کہ اپنی اس غلط نسبت کے تدارک میں کچھ لکھے اور احباب سے اپنی غلطی کا برملا اعتراف کرے۔ میری خوش قسمتی ہوئی کہ مجھے بھی موقع مل گیا کہ میں اپنی غلطی کی تلافی کر سکوں۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک کہ عزیز کے مکتوب کے سلسلہ میں جناب نے جو ذاتی وضاحت فرمائی، آج کے اس ماحول میں بقول حضرت مجدد علیہ الرحمۃ، جو اپنے مکتوب میں فرماتے ہیں:

"گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں درنمی آید، سواراں راچہ شُد

ہر چند سلامتی در زاویہ است اما دولتِ عزّ و شہادت در معرکہ است، کنج و زاویہ با اہلِ سر و ضعف مناسب است۔ در حدیث آمدہ : اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ۔ کار مردان اقویاء مبارزت و معرکہ کبریٰ است۔ قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ فَرَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ ھُوَ اَھْدٰی سَبِیْلًا[۱]" (مکتوب ۵۹ دفتر سوم ص ۱۲۸)

ہم زاویہ نشینان ضعیفان بجز دعا اور کیا کر سکتے ہیں۔ اللہ جو دلوں کا حال جانتا ہے اپنے دین کو سربلند فرمائے

والسلام
عاجز حمید فضلی

---

۱ (ترجمہ) توفیق و سعادت کی گیند درمیان میں انہوں نے پھینک دی ہے لیکن میدان میں کوئی نہیں آتا، سواروں کو کیا ہو گیا۔

باوجودیکہ سلامتی دامنِ خانقاہ کی تنہائی میں ہے لیکن عزتِ اُخروی اور شہادت کی دولت معرکہ کارزار میں ہے۔ خانقاہ اور تنہائی کمزور لوگوں کے لیے تو شاید مناسب ہو (لیکن مردانِ حُر کے لیے مناسب نہیں) حدیث میں آیا ہے کہ "قوی مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے" (اس لیے) قوی مَردوں کا کام باطل کو للکارنا اور میدانِ کارزار میں خم ٹھونک کر آنا ہے۔ (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے)

"اے نبیؐ فرما دیں کہ ہر شخص کام کرتا ہے اپنے ڈھنگ اور طریقے پر (لیکن) تیرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک راستہ کی رہنمائی کس کو میسر آئی ہے" (بنی اسرائیل آیت ۸۴)

بقیہ : عزیمتِ دعوت

منہجِ اصحابِ رسولؐ سے انحراف کیا۔ یہ کیا تھا کہ بڑے بڑے ائمہ عصر کو اعتراف کرنا پڑا کہ اگر کسی کو دیکھو کہ امام احمد سے محبت رکھتا ہے تو بس جان لو کہ صاحبِ سنت ہے۔ اس کسوٹی پر مسلم کو زندیق سے پرکھا جائے گا۔ (جاری ہے)

کتابیات

بارہواں کبیرہ

ترکِ نماز

مؤلف : ابو عبد الرحمن شبیر بن نور

نماز کی اہمیت

نماز کیا ہے ؟ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایک مستحکم عہد! بندہ نماز کے ذریعے اپنے تعلق، اپنی فرمانبرداری، اپنی عاجزی و انکسار اور اپنی غلامی و بندگی کا پانچ وقت اظہار کرتا ہے۔ اور جب تک یہ تعلق باقی رہتا ہے انسان کا دین کے ساتھ، اللہ کی شریعت اور قانون کے ساتھ رشتہ و ناطہ برقرار رہتا ہے۔ اور اگر یہ تعلق ٹوٹ جائے تو پھر انسان ہے اور اس کا نفس امارہ ہے۔ پھر انسان بالکلیہ شیطان کے رحم و کرم پر ہوتا ہے جو اسے کسی بھی لمحے گمراہی و ضلالت کی کسی بھی اندھیری کھائی میں دھکیل سکتا ہے۔ اسی لیے نماز ہر زمانے میں اور ہر اُمّت پر فرض رہی ہے اور کسی اُمّت کو اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ سورت الانبیاء میں سولہ انبیاء و رسل علیہم الصّلاۃ والسلام کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۝ [1]

"یہ تمہاری اُمّت حقیقت میں ایک ہی اُمّت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس تم میری عبادت کرو"۔

ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بال بچوں سمیت فلسطین کے زرخیز و شاداب بلکہ جنت نظیر علاقے سے مکہ کی بے آب و گیاہ زمین کی طرف صرف اس لیے ہجرت کی کہ نماز کا انتظام امرِ ربّ کے مطابق ہو سکے۔ اور بعد میں اپنی آل اولاد کو وہاں بیت اللہ شریف کے پاس چھوڑتے ہوئے جو دُعا مانگی اس میں بھی یہی مدّعا بیان کیا:

---

[1] سورت الانبیاء، آیت : ۹۲

رَبَّنَا اِنِّیٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ [1]

"پروردگار! میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصّے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار! یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں"

اور اپنی انفرادی دعاؤں میں بھی حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب کی جناب میں یہی تمنا پیش کی :

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ [2]

"اے میرے پروردگار! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد کو بھی۔ پروردگار! میری دعا قبول کر"

دیگر اُمتوں کی طرح نماز اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی فرض کی گئی۔ نماز کی اہمیت کا اندازہ اِس امر واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سارا دین اللہ تعالیٰ کے حکم سے ساتویں آسمان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہے، جبکہ نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرشِ معلیٰ کے پاس بلا کر عطا کی گئی۔ ابتداء میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں، بعد میں اُن کی تعداد گھٹا کر پانچ کر دی گئی، البتہ ثواب پچاس کا ہی ملتا رہے گا۔ درج ذیل حدیث میں اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے :

فُرِضَتْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ اُسْرِیَ بِهِ الصَّلٰوةُ خَمْسِيْنَ ثُمَّ نُقِصَتْ حَتّٰى جُعِلَتْ خَمْسًا ثُمَّ نُوْدِیَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّهٗ لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَاِنَّ لَكَ بِهٰذِهِ الْخَمْسِ خَمْسِيْنَ [3]

"معراج کی رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں، پھر اُن کو گھٹا کر پانچ کر دیا گیا،

---

[1] سورت ابراہیم، آیت ۳۷ [2] سورت ابراہیم، آیت ۴۰

[3] سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء کم فرض اللہ علیٰ عبادہ من الصلوات۔ اسی معنی کی حدیث صحیح بخاری و صحیح مسلم میں قصہ اسراء و معراج کے ضمن میں مذکور ہے۔

اس کے بعد ارشادِ ربانی ہوا: اے محمد، ہمارے ہاں فیصلے بدلا نہیں کرتے، تمہیں ان پانچ نمازوں کا اجر پچاس نمازوں کے برابر ہی ملے گا۔"

اسی اہمیت، فضیلت اور حیثیت کی وجہ سے کلمۂ توحید کے بعد سب سے پہلا فرض بلکہ دین کا سب سے پہلا عملی رکن "نماز" ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ، شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ، وَحَجِّ الْبَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ [1]

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ کلمۂ[1] شہادت "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا اقرار کرنا، نماز[2] قائم کرنا، زکوٰۃ[3] ادا کرنا، بیت[4] اللہ کا حج کرنا، رمضان[5] کے روزے رکھنا۔"

کلمۂ توحید کے بعد نماز ہی ایک ایسا منفرد و یکتا رکن ہے جو نہ معاف ہوتا ہے اور نہ کوئی دوسرا آدمی نائب بن کر اسے ادا کر سکتا ہے۔ زکوٰۃ صرف مالدار پر فرض ہوتی ہے، بعض صورتوں میں روزہ کفارہ ادا کرنے کے بعد معاف ہو جاتا ہے، حج بھی صرف مالداروں پر فرض ہے، مگر نماز سب پر فرض ہے اور کسی شکل میں معاف نہیں۔ آدمی مقیم ہو یا مسافر، حالتِ امن ہو یا حالتِ جنگ، نماز بہرحال پڑھنی ہی پڑھنی ہے حتیٰ کہ مریض آدمی کو بھی نماز معاف نہیں۔ مریض کھڑا نہیں ہو سکتا تو بیٹھ کر پڑھے، بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتا تو لیٹے لیٹے پڑھے، رکوع سجدہ نہیں کر سکتا تو اشارہ کر لے، لیکن جب تک ہوش و حواس قائم ہیں، معافی کسی شکل میں نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

صَلِّ قَائِمًا، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلٰى جَنْبٍ [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی بُنِیَ الاسلام علیٰ خمسٍ۔
صحیح مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب ارکان الاسلام۔

[2] صحیح بخاری، کتاب تقصیر الصلوٰۃ، باب صلاۃ القاعد بالایماء۔

"کھڑے ہوکر نماز ادا کرو، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو بیٹھ کر ادا کرو، اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر نماز ادا کرو۔"

اگر انسان پورے اہتمام اور احساسِ ذمہ داری سے بلکہ ذوق و شوق سے نماز ادا کرتا رہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت و عنایت میں رہتا ہے۔ اور جس کی خود اللہ حفاظت فرمائے اسے کس طرح کوئی تکلیف پہنچ سکتی ہے؟ اور جو جان بوجھ کر نماز چھوڑ دے وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت و عنایت سے محروم ہو جاتا ہے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

اَوْصَانِی رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم بِعَشْرِ کَلِمَاتٍ قَالَ:
لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ..... و ..... وَلَا تَتْرُكَنَّ صَلَاةً مَكْتُوبَةً مُتَعَمِّدًا
فَاِنَّهُ مَنْ تَرَكَ صَلَاةً مَكْتُوبَةً مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ [1]...

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس باتوں کی وصیت کی فرمایا:
تم کبھی بھی اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ اور ایک بھی فرض نماز جان بوجھ کر نہ چھوڑنا کیونکہ جس نے کوئی بھی فرض نماز جان بوجھ کر چھوڑ دی تو اللہ تعالیٰ کی حفاظت والی ذمہ داری اس سے ختم ہوگئی ۔ ۔ ۔"

واقعہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد کے متقی و پرہیزگار لوگوں کے نزدیک سب سے اہم چیز نماز کا اہتمام تھا اور انہیں سب سے عزیز بلکہ عزیز از جان کام نماز ہی تھا، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس فانی دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے جب آخری سانس لے رہے تھے تو نماز کی بار بار تاکید فرما رہے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

---

[1] سنن ابن ماجہ۔ کتاب الفتن باب الصبر علی البلاء۔ حدیث ۴۰۳۴۔ سنن البیہقی، ج ۷، ص ۳۰۴۔ متعدد طرق اور شواہد کی بنا پر حدیث صحیح ہے۔ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو ارواء الغلیل ج ۷، ص ۸۹ - ۹۱۔ حدیث ۲۰۲۶ تالیف محدث العصر الشیخ محمد ناصر الدین الالبانی۔

كَانَ عَامَّةُ وَصِيَّةِ رَسُوْلِ اللهِ صلى الله عليه وسلم وَهُوَ يُغَرْغِرُ بِنَفْسِهِ: اَلصَّلٰوةَ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ[1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری سانس لے رہے تھے اور بار بار اس بات کی وصیت فرما رہے تھے کہ نماز کا اہتمام رکھنا اور ماتحت لوگوں (غلام یا ملازم) کا خیال کرنا۔"

اس تاکید اور وصیت کی ایک خاص وجہ بھی کہ جب تک انسان کا رشتہ اپنے رب کے ساتھ بذریعہ نماز قائم ہے اس میں خیر اور بھلائی کی اُمید رکھی جا سکتی ہے اور اس کا دین ایمان بھی سلامت ہے اور اگر کسی نے نماز ہی کے معاملے میں سستی، کوتاہی اور لاپرواہی شروع کر دی تو دین کے دوسرے احکام کے بارے میں اُس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کارکنانِ خلافتِ راشدہ کو ہدایت دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اِنَّ اَهَمَّ اُمُوْرِكُمْ عِنْدِي الصَّلَاةُ، مَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَهُ وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا اَضْيَعُ[2]

"میرے نزدیک تمہارا سب سے اہم کام نماز ہے۔ جس نے نماز کی حفاظت کی اور اسے پابندی سے ادا کیا اس نے اپنے دین کی حفاظت کر لی۔ اور جو نماز ہی کو ضائع کر بیٹھا وہ باقی دین کو اور زیادہ (لاپرواہی سے) ضائع کرنے والا ثابت ہو گا۔"

تارکِ نماز کا حکم

نماز اس قدر مہتم بالشان عمل ہے کہ دنیا و آخرت میں دین کا سارا دارومدار اسی پر ہے۔ اس

---

[1] مسند امام احمد، ج ۳، ص ۱۱۷۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الوصایا۔ باب ہل اوصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث ۲۶۹۷۔ صحیح ابن حبان، حدیث ۱۲۲۰۔
حدیث صحیح ہے۔ ملاحظہ ہو ارواء الغلیل ج ۷، ص ۲۳۷، حدیث ۲۱۷۸۔

[2] موطا امام مالک، کتاب وقوت الصلاۃ، باب وقوت الصلاۃ، حدیث ۶۔

سلسلے میں کوتاہی کرنے والے کی ہر دو مقامات پر سخت گرفت ہو گی۔ نماز ضائع کرنے والوں کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا [1]

متعدد انبیاء و رسل کی انفرادی خوبیاں ذکر کرنے اور ان کی تعریف فرمانے کے بعد کہا: "پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ اُن کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی۔ پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں۔"

"نماز ضائع کرنے کی" دو صورتیں ہوتی ہیں: ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان نماز کے بارے میں لاپرواہ ہو جائے، کبھی جی میں آ گیا یا گھیرے میں پڑ گئے تو پڑھ لی ورنہ چھٹی۔ اور جب پڑھی بھی تو وقت بے وقت، اور اتنی جلدی جلدی کہ جیسے مرغ ٹھونگ مار رہا ہو۔ اور اگر کبھی جماعت سے پڑھنی پڑ جائے تو کپڑوں سے یا جسم سے کھیلنا شروع کر دے، یا بار بار کسی چیز کی طرف عمداً متوجہ ہوتا رہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اس کا دل نماز میں نہیں ہے بلکہ بس جسم بندھا ہوا ہے۔ اسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی نماز سے تعبیر کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایسے نمازیوں کے لیے کسی اجر و ثواب کے بجائے سخت وعید سنائی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ [2]

"پھر تباہی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں۔"

"نماز ضائع کرنے کی" دوسری صورت یہ ہے کہ انسان بالکل نماز نہ پڑھے۔ مسلمان کہلانے کے باوجود اسے نماز کے الفاظ تک نہ آتے ہوں۔ یہ صورت پہلی صورت سے بھی گمبھیر اور خطرناک ہے۔

---

[1] سورت مریم، آیت ۵۹۔ [2] سورت الماعون، آیات ۴-۶

ایسے بدنصیب انسان کا آخر دین میں کیا حصّہ باقی ہے؟ اس میں اور ایک بے دین، مشرک، ہندو، عیسائی اور یہودی میں عملاً کیا فرق ہے؟ یقیناً یہ آدمی کافر اور خارج از اسلام ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر واضح لفظوں میں اس بات کو دہرایا۔ آپؐ نے فرمایا:

بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ تَرْكُ الصَّلَاةِ۔[1]

"آدمی اور شرک کے درمیان نماز چھوڑنے کا معاملہ حائل ہے۔"

بَيْنَ الْكُفْرِ وَالْإِيمَانِ تَرْكُ الصَّلَاةِ۔[2]

"کفر اور ایمان کے درمیان حدِ فاصل نماز چھوڑ دینا ہے۔"

اَلْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ۔[3]

"ہمارے اور کافروں کے درمیان اصل فرق نماز کا ہے۔ پس جس نے نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔"

ان واضح، دوٹوک اور غیر مبہم احادیث کی وجہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماعی فتویٰ ہے کہ نماز کا تارک کافر ہے اور ملّتِ اسلامیہ سے خارج ہے۔ چنانچہ

حضرت عبداللہ بن شقیق رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصّلاۃ۔

[2] سنن الترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی ترک الصّلاۃ۔

اسی مفہوم کی حدیث سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فی ردّ الارجاء میں موجود ہے۔

[3] مسند امام احمد، ج ۵، ص ۳۴۶۔ سنن الترمذی کتاب الایمان باب ماجاء فی ترک الصلوٰۃ۔ سنن النسائی، کتاب الصّلاۃ، باب الحکم فی تارک الصّلاۃ۔ المستدرک للحاکم، کتاب الایمان باب التشدید فی ترک الصّلاۃ۔ امام حاکم اور محدث العصر الشیخ الالبانی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح الجامع الصغیر حدیث ۴۱۴۳۔

كَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَا يَرَوْنَ شَيْئًا مِنَ الْاَعْمَالِ تَرْكُهٗ كُفْرًا غَيْرَ الصَّلٰوةِ [1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کسی نیک کام کے چھوڑنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے سوائے نماز کے"۔

یہ فتویٰ صرف صحابہ کرام کا ہی نہیں بلکہ بعد کے دَورِ تابعین اور تبع تابعین میں بھی متعدد امام اور اہلِ علم اسی فتوے کے قائل رہے ہیں۔

اگر کہیں تھوڑا بہت اختلاف ہوا ہے تو صرف اس معنی میں کہ اس کو مرتد کہا جائے یا کافر مطلق گردانا جائے، اسے توبہ کی مہلت دی جائے یا فوراً سزا نافذ کر دی جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

فقہاءِ امت کی عظیم اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ نماز کا تارک کافر ہے۔ اور امتِ مسلمہ سے خارج ہے۔ جب یہ طے پا گیا کہ وہ کافر ہے تو پھر اسلامی حکومت میں وہ درجہ دوم کا شہری ہوگا۔ لہٰذا جزیہ ادا کرے گا اور جہاد میں شریک نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی کسی اہم منصب پر فائز ہونے کا اسے حق ہوگا۔ اسی طرح کسی مسلمان خاتون سے اس کا نکاح نہیں ہو سکتا اور پہلے سے موجود نکاح فسخ ہو جائے گا۔ نہ ہی مسلمان اس کے ہاتھ کا ذبیحہ کھائیں گے۔ مرنے کے بعد اسے شرعی کفن کی بجائے ایک چادر میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے گا۔ اس کی نمازِ جنازہ ادا نہ ہوگی۔ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی اس کا ورثہ مسلمان وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ الغرض مرنے سے پہلے اور مرنے کے بعد اس کے ساتھ ہر طرح کافروں والا سلوک ہوگا۔

تارک نماز کا برزخ میں حال

انسان کو اِس دار العمل یعنی دنیا سے کوچ کرنے کے بعد ایک وقت تک عالمِ برزخ میں رہنا ہے۔ اگر نیک لوگوں کے لیے عالمِ برزخ بہشت نما مقام ہے تو بدکاروں کے لیے جہنم کا گڑھا۔ ایک

---

[1] سنن الترمذی۔ باب ما جاء فی ترک الصّلاۃ۔ سند حسن ہے۔

موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ برزخ کی سیر کروائی گئی۔ متعدد لوگوں کے انجام کے ساتھ ساتھ تارکینِ نماز کا جو انجام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا اس کی تفصیل اِن لفظوں میں بیان فرمائی:

اِنَّہٗ قَالَ لَنَا ذَاتَ غَدَاۃٍ: اِنَّہٗ اَتَانِی اللَّیْلَۃَ آتِیَانِ وَاِنَّھُمَا ابْتَعَثَانِی وَاِنَّھُمَا قَالَا لِی: اِنْطَلِقْ، وَاِنِّی اِنْطَلَقْتُ مَعَھُمَا وَاِنَّا اَتَیْنَا عَلٰی رَجُلٍ مُضْطَجِعٍ وَاِذَا آخَرُ قَائِمٌ عَلَیْہِ بِصَخْرَۃٍ، وَاِذَا ھُوَ یَھْوِی بِالصَّخْرَۃِ لِرَاْسِہٖ فَیَتَدَھْدَہُ الْحَجَرُ ھَا ھُنَا فَیَتْبَعُ الْحَجَرَ، فَیَاْخُذُہٗ فَلَا یَرْجِعُ حَتّٰی یَصِحَّ رَاْسُہٗ کَمَا کَانَ ثُمَّ یَعُوْدُ عَلَیْہِ فَیَفْعَلُ بِہٖ مِثْلَ مَا فَعَلَ بِہِ الْمَرَّۃَ الْاُوْلٰی... ..... اَمَّا الرَّجُلُ الْاَوَّلُ الَّذِی اَتَیْتَ عَلَیْہِ یُثْلَغُ رَاْسُہٗ بِالْحَجَرِ فَاِنَّہُ الرَّجُلُ یَاْخُذُ بِالْقُرْآنِ فَیَرْفُضُہٗ وَیَنَامُ عَنِ الصَّلَاۃِ الْمَکْتُوْبَۃِ[1]

ایک صبح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا: "آج رات میرے پاس ۲ دو فرشتے آئے، انہوں نے مجھے اٹھایا اور کہا: ہمارے ساتھ چلئے، اور میں اُن کے ساتھ ہو لیا، ہم ایک ایسے شخص کے پاس آئے جو چیت لیٹا ہوا تھا، اور ایک دوسرا آدمی اُس کے سر کے پاس پتھر لیے کھڑا تھا۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ وہ شخص اس لیٹے ہوئے آدمی کے سَر پر پتھر مارتا ہے، پھر پتھر کچھ دُور تک لڑھکتا ہوا جاتا ہے اور وہ شخص پتھر کے پیچھے پیچھے جاتا ہے مگر اسے اٹھا کر واپس لانے سے پہلے پہلے اس لیٹے ہوئے آدمی کا سر بالکل ٹھیک ٹھاک ہو چکا ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے صحیح سالم تھا، وہ آدمی آکر پھر اسی طرح اُس کے سر پر پتھر مارتا ہے جس طرح اس نے پہلی مرتبہ مارا تھا"۔۔۔۔ (گویا کہ یہ معاملہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ پھر آپ آگے بڑھتے ہیں۔ آپ کو متعدد ہولناک اور خوشگوار مناظر اور افراد دکھائے جاتے ہیں۔ پھر فرشتے آپ کو بتلاتے ہیں کہ:) "وہ پہلا آدمی جس

---

[1] صحیح بخاری، کتاب تعبیر الرّؤیا، باب تعبیر الرّؤیا بعد صلاۃ الصبح۔

کے پاس سے آپ گزرے تھے اور جس کا سر پتھر سے کچلا جارہا تھا وہ ایسے آدمی کا انجام ہے جو قرآن کریم یاد تو کرتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا اور فرض نماز سے سویا رہتا ہے۔

عالمِ برزخ میں انسان کا قیام، آخری منزل (جنت یا دوزخ) کے منتظر مسافر کی حیثیت سے ہوگا، خواہ یہ مرحلہ ہزاروں لاکھوں سال پر محیط ہو۔ نیک و متقی انسان کے ساتھ یقیناً شاہی مہمان کا سا سلوک ہوگا، لیکن بدکردار قانون شکن اور باغی انسان کے ساتھ مجرموں والا معاملہ ہوگا۔ اور صورتِ حال اسی طرح حشر کا میدان بپا ہونے تک قائم رہے گی۔

قیامت کے روز بے نماز کا انجام

جس طرح دنیا میں کاروبارِ زندگی چلانے کے لیے آنکھوں کی بینائی کے علاوہ گرد و پیش کا روشن ہونا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح آخرت میں بھی روزِ قیامت ہر انسان کو روشنی کی ضرورت ہوگی۔ وہاں اجتماعی روشنی کے بجائے انفرادی روشنی کام آئے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ[1]

(اُس دن جبکہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ اُن کا نور ان کے آگے آگے اور اُن کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا)

یہی مضمون سورت التحریم آیت ۸ میں بھی بیان ہوا ہے۔ البتہ تارکینِ نماز اس نور سے یکسر محروم ہوں گے۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اس مضمون کو درج ذیل الفاظ میں بیان فرمایا:

مَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا كَانَتْ لَهٗ نُوْرًا وَبُرْهَانًا وَنَجَاةً
يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ لَّمْ يُحَافِظْ عَلَيْهَا لَمْ يَكُنْ لَّهٗ نُوْرٌ
وَلَا بُرْهَانٌ وَلَا نَجَاةٌ وَكَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ قَارُوْنَ وَ

---

[1] سورت الحدید، آیت ۱۲

فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَ اُبَیِّ بْنِ خَلَفٍ۔[1]

"جس نے نماز کو پابندی سے ادا کیا تو یہ نماز قیامت کے روز نمازی کے لیے روشنی کا سامان بن جائے گی، اس کے حق میں دلیل ہوگی، اور اُس کا ذریعۂ نجات ہوگی، اور جس نے نماز کی پابندی نہ کی اس کے لیے نہ روشنی ہوگی، نہ دلیل ہوگی اور نہ ہی اسے نجات ملے گی، بلکہ قیامت کے روز وہ قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کا ساتھی ہوگا۔"

ایک طویل عرصے تک میدانِ حشر میں اپنے اپنے اعمال وکردار کے اعتبار سے مختلف مقامات و درجات پر کھڑے رہنے کے بعد جب حساب شروع ہوگا تو ہر انسان کے اعمال نامے میں سب سے پہلے نماز کی پڑتال ہوگی۔ اگر اس پہلے سوال میں کامیابی ہوگئی تو باقی مرحلہ قدرے آسان ہوجائیگا اور اگر اس اہم ترین سوال میں انسان فیل ہوگیا تو پھر باقی حساب میں خسارے اور گھاٹے کے علاوہ کچھ نہیں رکھا ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اَوَّلَ مَا یُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنْ عَمَلِهٖ صَلَاتُهٗ فَاِنْ صَلُحَتْ فَقَدْ اَفْلَحَ وَاَنْجَحَ وَاِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ فَاِنِ انْتَقَصَ مِنْ فَرِیْضَتِهٖ شَیْءٌ قَالَ الرَّبُّ عَزَّوَجَلَّ اُنْظُرُوا هَلْ لِعَبْدِیْ مِنْ تَطَوُّعٍ فَیُکَمَّلُ بِهَا مَا انْتَقَصَ مِنْ فَرْضِهٖ ثُمَّ یَکُوْنُ سَائِرُ عَمَلِهٖ عَلٰی ذٰلِکَ[2]

---

[1] مسند امام احمد، حدیث ر۶۵۷۶، تخریج محدث العصر الشیخ احمد شاکر و سنن الدارمی، کتاب الرقائق، باب فی المحافظۃ علی الصّلاۃ، ج ۲، ص ۳۰۱۔ صحیح ابن حبان، حدیث ر۲۵۴۔ شیخ احمد شاکر نے تحقیقِ مسند کے اندر اور امام منذری نے الترغیب والترہیب ج ۱، ص ۳۸۶ میں حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

[2] سنن الترمذی، کتاب الصّلاۃ، باب ماجاء اَنَّ اوّل مایحاسب بہ العبد صلاتہ۔ الفاظ حدیث سنن الترمذی سے ماخوذ ہیں۔ البتہ مسند امام احمد ج ۲، ص ۲۹۰۔ سنن النسائی، کتاب الصلاۃ، باب المحاسبۃ علی الصّلاۃ، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

"قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سب سے پہلے اس کی نماز کا حساب ہو گا۔ اگر نماز کمل ہوتی تو وہ بچ گیا اور نجات پا گیا اور اگر نماز کا معاملہ بگڑا ہوا نکلا تو یقیناً وہ فیل ہو گیا اور خسارے میں رہا۔ پس اگر اُس کے فرائض میں کچھ تھوڑا نقص ہوا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: غور سے دیکھو کیا میرے بندے کے کھاتے میں کچھ نفل نمازیں ہیں۔ اگر موجود ہوئیں تو ان نوافل کے ذریعے فرائض کی کمی پوری کر دی جائے گی۔ پھر اس کے بعد بندے کے تمام اعمال کا حساب اسی انداز پر ہو گا"

جو لوگ اس اُخروی امتحان میں نماز کے بعد دیگر سوالوں کا صحیح نتیجہ نکلنے کے بعد کامیاب قرار دے دیئے جائیں گے وہ تو صد مبارکباد بلکہ ہزاروں لاکھوں مرتبہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ البتہ جس انسان کو پہلے ہی سوال (یعنی نماز کے معاملہ میں) کے جواب میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا وہ واقعۃً بڑے شدید گھاٹے میں ہے۔ اسے حوالۂ جہنم کر دیا جائے گا۔ اور کچھ بعید نہیں کہ وہ مستقل جہنم میں ہی سڑتا گلتا رہے گا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تارکِ نماز کو فرعون، ہامان، قارون اور ابی بن خلف کا ساتھی قرار دیا ہے، اور یہ لوگ چونکہ توحید و رسالت کے انکار کے جرم میں ابدالآباد تک جہنم میں ہی رہیں گے اس لیے تارک نماز بھی مستقل جہنمی ہو سکتا ہے کیونکہ عملاً تو اُس نے بھی ترکِ نماز کے ذریعہ اللہ کی عبادت اور رسول کی اطاعت سے انکار کر دیا ہے خواہ وہ مسلمان خاندان کا فرد کیوں نہ ہو اور کیسا ہی خوبصورت اس کا نام کیوں نہ ہو، اور زبانی زبانی کیسا ہی عاشقِ رسول، فدائے اہلِ بیت اور شیدائے اسلام کیوں نہ بنا رہے۔ جب تک نماز کا اہتمام کر کے وہ اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت فراہم نہیں کرتا وہ دنیا میں بھی کافر قرار پائے گا اور آخرت میں بھی انہی کے ساتھ اُس کا انجام ہو گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝ إِلَّآ أَصْحَٰبَ ٱلْيَمِينِ ۝ فِى جَنَّٰتٍۢ يَتَسَآءَلُونَ ۝

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) المستدرک للحاکم کتاب الصلاۃ باب اوّل ما یحاسب بہ العبد میں بھی حدیث جزوی یا معنوی طور پر مذکور ہے۔ امام حاکم اور محدث العصر شیخ الالبانی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح الجامع الصغیر حدیث ۲۵۷۴۔

عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ○ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ○ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○[1]

"ہر شخص اپنے کرتوت کے بندھن میں بندھا ہے، سوائے دائیں بازو والوں کے جو جنتوں میں ہوں گے۔ وہ مجرموں سے پوچھیں گے: "تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟" وہ کہیں گے: "ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے"۔

لیجئے جناب! اللہ تعالیٰ کا فیصلہ قرآن کریم کے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں موجود ہے کہ نماز نہ پڑھنے والا دوزخ میں ہوگا۔ اب جسے جہنم سے نجات پانا مطلوب ہو اس کا راستہ نمازیوں کے ساتھ ہے اور جسے جہنم پسند ہو، یا پھر اُسے قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت پر ایمان ہی نہ ہو، وہ چاہے نماز کے وقت کاروبار کرتا رہے، چاہے سیر سپاٹا کرے یا آرام سے بستر پر لیٹا رہے، اس کے لیے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاح بے معنی کلمات کا نام ہے۔

---

[1] سورت المدثر، آیت ۳۸-۴۳

ضرورت رشتہ

تنظیم اسلامی لاہور کے سینئر رفیق (پہلی بیوی فوت ہو گئی ہے) عمر ۵۰ سال آفیسر گریڈ ۱۸ کیلئے تقریباً ۴۰ سالہ دیندار شریک حیات کا رشتہ درکار ہے۔ نکاح و رخصتی سادگی سے ہوگی۔

برائے رابطہ: ن م معرفت دفتر تنظیم اسلامی ۴ اے مزنگ روڈ لاہور

تنظیم اسلامی سے وابستہ ایک اسسٹنٹ پروفیسر کی بیٹی، تعلیم ایف ایس سی (میڈیکل)، عمر ۱۷ سال، کے لئے موزوں رشتہ درکار ہے۔ عقد ثانی کے خواہشمند حضرات رجوع نہ فرمائیں۔

برائے رابطہ معرفت ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ شعبہ اردو
گورنمنٹ ڈگری کالج حافظ آباد (پوسٹ کوڈ ۵۲۱۱۰) فون: ۲۰۴۴۳

عزیمتِ دعوت

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک اہم تالیف "تذکرہ" سے ماخوذ

تلخیص وتدوین : ڈاکٹر محمد عثمان

ہر عہدِ ظہورِ اصلاح و دعوت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو ہزاروں علماءِ ملت اور اربابِ زہد و اطاعت موجود ہوتے ہیں' درس و تعلیمِ علوم' ہنگامۂ مجالس و مواعظ' غلغلۂ اذکار و اشغال' خانقاہوں میں مجاہدات و ریاضات کے حلقے قائم اور صحنِ مساجد میں تلاوتِ قرآن و وظائف و اوراد کی صدائیں گرم ہوتی ہیں' لیکن ساتھ ہی دوسری طرف یہ حال ہوتا ہے کہ ظلم و طغیان ہرچہار جانب سے محیط' نورِ حق و صداقت مستور و محجوب' بدعات و محدثات کی گرم بازاری' منکرات وسیئات کی مقبولیت و طلب کا دَور دَورہ' اہلِ حق و صدق مظلوم و مقہور' خدا کی زمین پر اس کے کلمۂ حق و عدل کا کہنا بمنزلۂ جرم اور ظلم و عدوان کے لئے اجر و بخشش۔ یہ سب کچھ علانیہ سورج کی روشنی میں ہوتا ہے اور مدرسوں میں شور مچانے والے اندھے نہیں ہوجاتے اور نہ خانقاہوں میں چھپنے والے بہرے ہوتے ہیں' سب کی سرکی آنکھیں روشن ہوتی ہیں اور اوپر کے کان کھلے' لیکن دل کی بصیرت اس طرح اندھی اور عبرت کے کان اس طرح بہرے ہوجاتے ہیں کہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں' مگران کے لئے دیکھا ہوا اَن دیکھا اور سنا ہوا اَن سنا ہو جاتا ہے۔ دیکھنے پر بھی کسی کی زبان نہیں کھلتی اور سننے پر بھی کسی کا قدم نہیں اٹھتا۔ نفس کا عشق اور تمتعاتِ دنیوی کی شیفتگی اس طرح ان کے جسموں میں حلول کر جاتی ہے کہ ہمت کی روح اور عزم کی قوت کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ راہِ عمل کا ہر تنکا ان کے لئے پہاڑ اور جادۂ ابتلاء کا ہر کانٹا تیر و خنجر بن کر ان کو ڈراتا اور ستاتا ہے۔ وہ آنکھیں جن میں غمِ نفس اور ماتمِ دنیا کے لئے آنسوؤں کے دریا بند ہوتے ہیں حق کی غمگینی اور امت کے ماتم کے لئے ایک قطرۂ اشک بھی نہیں رکھتیں اور جن دلوں میں عشقِ ذات اور محبتِ اہل و

عیال کے لئے ایک عالمِ شورش اور طوفانِ اضطراب مخفی ہوتا ہے، اس میں اللہ اور اس کے کلمۂ حق کے لئے درد کی ایک ٹیس اور غم کی ایک چبھن بھی پیدا نہیں ہوتی تو عین اُس وقت کفر و ضلالت اور بدعات و منکرات کے غلبہ و قہر سے ارضِ الٰہی کا ایک ایک کونا چیختا اور چلاتا ہے اور فضاء کائنات کا ایک ایک ذرہ داعیٔ حق کے لئے روتا ہے، مگر کسی کو اس کی توفیق نہیں ملتی کہ اپنے عہد و دور کی طلبِ دعوت اور سوالِ قیامِ ہدایت پر مردانہ وار لبیک کہے، اور ظلمت کدۂ ضعف و درماندگی سے نکل کر راہِ عزیمت و دعوت میں قدم رکھے، تو اُس وقت تم دیکھتے ہو کہ جس راہ میں قدم رکھنے سے ایک عالم درماندہ و ناچار تھا اچانک ایک مردِ ہمت اٹھتا ہے اور نہ صرف قدم رکھتا ہے بلکہ دوڑتا ہوا چلاجاتا ہے۔ راہ کی مشکلیں اور صعوبتیں اس کے جولانِ قدم کے لئے ایک مشتِ غبار اور ایک تودۂ خس و خاشاک سے زیادہ حکم نہیں رکھتیں۔ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں اور وہ بڑھ کر عزیمت، دعوت اور ہدایتِ عامہ کا بابِ مسدود کھول دیتا ہے۔ اگرچہ اُس عہد میں ہزاروں مدّعیانِ کار موجود ہوں مگر اس فضیلتِ مخصوص میں اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہوتا۔ صرف اس کو اُس عہد کی اقلیمِ ہدایت کی سلطانی و فرمانروائی پہنچتی ہے اور صرف وہی اپنے زمانے کا کلید بردارِ خزائنِ برکات و فیضانِ سماویہ ہوتا ہے۔ تمام اصحابِ طریق ناچار ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے چراغ اس مصباحِ ہدایت سے روشن کریں اور تمام رہروانِ جادۂ مقصد مجبور ہوتے ہیں کہ اس کے کاروانِ و فضل و قافلۂ کرامت کی آواز پر اپنے قدم اٹھائیں۔ **ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیہِ مَنْ یَّشَاءُ۔**

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

لیکن اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اس عہد میں بجز ایک زبان کے کلمۂ حق دوسری زبان پر جاری نہیں ہوتا یا اس عہد میں اور کوئی دعوت و تبلیغِ حق کے لئے ساعی و جاہد نہیں ہوتا۔ سخت سے سخت عہدِ شر و فساد اور ظلمت و ضلالت میں بھی ایک جماعت اہلِ حق کی ضرور باقی رہتی ہے اور یہ اس عزیز العلیم کی تقدیر اور فطرتِ کائنات کے داعیہ و مقتضی کے خلاف ہے کہ کوئی زمانہ اور کوئی گوشہ اہلِ حق سے بالکل خالی ہوجائے کہ انبیاءِ کرام کے ظہور کے وقت بھی باوجود **"ظَہَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ"**

کے ایک جماعت اہلِ حق کی ضرور باقی رہتی تھی۔ خود قرآن حکیم نے جا بجا اس کا اعتراف کیا ہے:

فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ[1] (سورۂ ھود آیت ۱۱۶)

اور سورۂ آلِ عمران میں ہے:

لَيْسُوْا سَوَآءً ۗ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ ○ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[2] (آیات ۱۱۳-۱۱۴)

اِن آیات سے معلوم ہوا کہ سخت سے سخت دورِ ظلمت و فساد میں بھی ایک جماعت داعیانِ حق کی ضرور باقی رہتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ حق کی دعوت و تبلیغ کرنے والے بالکل نہ ہوں یا نفسِ دعوت میں ان کا کوئی سہیم و شریک نہ ہو' لیکن اربابِ دعوت کی پستیٔ ہمت' بلندی و وسعتِ میدانِ عمل سے گھبراتی اور اس کے لئے اپنے کو درماندہ پاتی ہے اور محض ایک محدود دائرۂ دعوت پر قناعت کر لیتی ہے۔ حالانکہ ہر چیز کی طرح اس کے بھی مراتب و مدارج ہیں اور گو ہر مرتبہ اس میں داخل' لیکن ہر مرتبہ کا حکم دوسرے سے مختلف۔ اپنے پڑوس کو برائی کرتے دیکھ کر ٹوک دینا بھی نہی عن المنکر ہے۔ تمام شہر کو برائی سے باز رکھنے کے لئے کھڑا ہو جانا بھی نہی عن المنکر ہے اور اپنے عہد و دور کے شر و فساد کو دور کرنے کے لئے بلاامتیازِ قرب و بُعد اور مشرق و مغرب غلغلۂ عمل بلند کرنا بھی نہی عن المنکر ہے۔ اس طرح مسلمانوں کے راستہ سے پتھر ہٹا دینا بھی ایمان کی شاخ اور عملِ حق' مگر تمام امت کی راہ سے سنگِ بطلان و فساد کو دور کر دینا بھی عملِ ایمان و اقدامِ

---

[1] (ترجمہ) "پھر ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جو امتیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں ان میں اہل خیر باقی رہے ہوتے کہ لوگوں کو ملک میں فساد سے روکتے۔ سو ایسے لوگ تھے تو سہی مگر تھوڑے جنہیں ہم نے عذاب سے بچالیا"۔

[2] (ترجمہ) "لیکن یہ سب یکساں نہیں ہیں۔ اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں' راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے حضور سر بسجود ہوتے ہیں' اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں' بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں"۔

حق ہے۔ پھر کیا ان تمام مراتب کا ایک ہی حکم ہو سکتا ہے؟ کجا وہ مقامِ ارفع و اعلیٰ جہاں ایک عالَم و اُمت کی اصلاح کے لئے قدم اٹھائے جائیں اور کجا وہ تنگنائے ضعف جہاں اپنے پڑوس کی اصلاح پر قناعت کر لی جائے؟ اصلاح دونوں ہیں، لیکن پہلا منصبِ نبوت کی شاخ اور دوسرا افرادِ امت میں سے ایک فردِ مومنِ صالح کا مرتبہ اور بس۔ پس یا تو دعوتِ حق کا سلسلہ موجود ہوتا ہے مگر ایک محدود دائرے سے باہر قدم نہیں نکالتا، یا ایسا ہوتا ہے کہ دعوت کی صدائیں بڑی دھیمی اور پست ہوتی ہیں اور ان میں وہ گرج اور کڑک نہیں پائی جاتی جس کے بغیر سرشارانِ غفلت چونک نہیں سکتے۔ اس لئے گو اٹھتی رہتی ہیں لیکن اپنے عہد کو چونکا دینے کا شرف حاصل نہیں کر سکتیں۔ یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ منہاجِ نبوت کے علوم و اعمال کو ان کی دعوت میں غلبہ و احاطہ حاصل نہیں ہوتا یا کتاب و سنت کی دعوتِ خالص و بے آمیزش کی حقیقت سے خالی ہوتی ہیں یا اصل کی جگہ کسی ایک ایسی فرع کی حفاظت کو عزیمتِ دعوت سمجھ لیا جاتا ہے جو ناقابلِ اعتناء تھی یا اس سے بڑھ کر مصیبت یہ کہ دعوۃ الی الحق کے لئے قدم اٹھا مگر سنت کی روشنی کی جگہ بدعت کی اندھیاری چھا گئی اور طریقِ کار بدعت کی آمیزش سے محفوظ نہ رہا۔ یا دعوت، تبلیغ کے بلند مقامات کی طرف ایسے نو آموزانِ راہ اور خام مغزانِ کار نے قدم اٹھایا جو گو اپنے ولولوں اور نیتوں کے لحاظ سے مستحقِ تحسین ہیں لیکن اس مقام کے لئے جس قوتِ علمی و عملی کی ضرورت ہے اور جس ثباتِ قلب و رسوخِ عزم کی، وہ ابھی ان سے منزلوں دُور ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یا تو اول قدم ہی میں ٹھوکر لگتی ہے یا پہلے تیر پر ہی میدانِ کارزار کو پیٹھ دکھلا دیتے ہیں۔

غرضیکہ ایک چیز دعوت ہے اور ایک عزیمتِ دعوت، اور ایک عزیمتِ دعوت کا درجۂ تجدید و مقامِ قیامِ دعوتِ عامہ اور ایک مقامِ اصلاحِ افراد کا ہے، ایک عائلہ و جماعت کا اور ایک امت و نوع کا۔ سو اگرچہ دعوت تو موجود ہوتی ہے مگر عزیمتِ دعوت مفقود ہو جاتی ہے اور اگرچہ اصلاحِ افراد کا سامان ہوتا ہے مگر اصلاحِ امت کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ جابجا "عزیمتِ دعوت" کا لفظ بولا گیا نہ کہ مجرد دعوت کا۔ دونوں میں فرق و امتیاز ملحوظ خاطر رہے۔ پس اپنے عہد کا مجدد وہ شخص یا وہ چند نفوسِ خاصہ ہوتے

ہیں جو مجرد دعوت نہیں بلکہ عزائم امورِ دعوت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں اور قیامِ حق کا صور اس زور سے پھونکتے ہیں کہ یکایک فضاءِ ملت جنبش میں آجاتی ہے اور تمام امواتِ غفلت اپنی اپنی قبروں کے اندر چونک اٹھتے اور اٹھ کر دوڑنے لگتے ہیں۔ یہی وہ مقامِ مخصوص ہے جو ہر عہد میں صرف ایک یا چند افراد عالیہ ہی کے حصے میں آتا ہے۔

اگر تاریخ اسلام کے مختلف ادوار اور سلسلۂ دعوت و تجدیدِ امتِ مرحومہ کی پچھلی کڑیوں پر نظر ڈالو تو یہ جو کچھ کہا گیا اس کی تصدیق ہر دور کے واقعات پیش کریں گے۔ ہر دور میں تم پاؤ گے کہ اگرچہ علماء و صلحاء امت کی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی اور ان کا فضل و کمال اور ورع و تقویٰ ہر طرح مسلم و ثابت ہے' بلکہ بعض ان میں ایسے تھے کہ علم و عمل کی متعدد شاخوں میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے' بایں ہمہ اس عہد کی عزیمتِ دعوت اور تجدیدِ ملت کے مرتبۂ مخصوص میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوا اور صرف چند افرادِ عزائم ہی کی قسمت میں آیا۔ یا تو ان کے قدم ہمت نے علم و عمل کی دوسری شاخوں پر قناعت کرلی یا اس راہ میں قدم بڑھانے کی جرأت ہی نہ کرسکے۔ عبدالملک بن مروان کا زمانہ اجلہ تابعین و حفاظِ سنت سے مملو تھا' لیکن اتباعِ سنت و قیامِ حق کی راہ میں سو دُروں کی مار مردانہ وار برداشت کرلینے اور مبغوضِ مبتدعینِ آل مروان اور محبوبِ قلوبِ مومنین ہونے کا جو شرفِ مخصوص سید التابعین حضرت سعید بن المسیبؒ کے حصہ میں آیا اس میں تو ان کا کوئی سہیم و شریک نہ تھا! خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں کون کہہ سکتا ہے کہ اصحابِ علم و عمل کا کال تھا لیکن معلوم ہے کہ شاہانِ جور کے مقابلے میں ثباتِ حق و اعتقاد کا جو مقامِ عزیمت امام دار الہجرت حضرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہما کو ملا وہ تو صرف انہی کے لئے تھا۔ یہ کیا چیز تھی کہ عین اس وقت جبکہ مشکیں اس زور سے کس دی گئیں تھیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گیا تھا اور ستر کوڑوں کی ضربیں ان کے جسمِ اقدس پر پڑ رہی تھیں تو اسی اونٹ کی پیٹھ پر کھڑے ہوگئے جس پر تذلیل و تشہیر کے لئے سوار کرایا گیا تھا اور پکار کر کہا:

مَن عَرَفَنِي فَقَد عَرَفَنِي و مَن لَم يعرفني فَانَا مالكُ بنُ انسٍ اقول انّ طلاقَ المُكرَهِ ليس بشيءٍ

یعنی: جو مجھ کو جانتا ہے سو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں ہوں

مالک انس کا بیٹا اور اس مسئلہ کا اعلان کرتا ہوں (جس کے اعلان سے مجھ کو جبراً روکا جارہا ہے) کہ طلاقِ مکرہ (جبری طلاق) کوئی چیز نہیں!

کیا خوب فرمایا حافظ ابن جوزیؒ نے امام موصوف کے حالات میں کہ **"وَ کَانَّما کَانَت تِلکَ السِّیاطُ حُلِیّاً حُلِّیَ بِہ"** یعنی ان کو کوڑوں سے پیٹا گیا اور مشکیں کسی گئیں لیکن ان باتوں سے ان کی عزت و عظمت گھٹنے کی جگہ اور بڑھ گئی۔ گویا یہ ضرب تازیانہ ان کے جمالِ عظمت و اجلال کا زیور تھا کہ جب پہنا دیا گیا تو اس کی رعنائی و خوبروئی دو چند ہو گئی۔

تیسری صدی کے اوائل میں جب فتنۂ اعتزال نے سر اٹھایا اور صرف ایک نہیں بلکہ لگا تار تین عظیم الشان فرمانرواؤں یعنی مامون، معتصم اور واثق باللہ کی شمشیرِ استبداد اور قہرِ حکومت نے اس فتنہ کا ساتھ دیا تو کیا اس وقت علماءِ امت اور ائمہ شریعت سے عالمِ اسلامی خالی ہو گیا تھا؟ غور تو کرو کیسے اساطینِ علم و فن اور اکابرِ فضل و کمال اس عہد میں موجود تھے۔ خود بغداد علماء اہل سنت و حدیث کا مرکز تھا مگر سب دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے اور عزیمتِ دعوت اور کمالِ مرتبہ وراثت و نبوت و قیامِ حق و ہدایت فی الارض وَ الامت کا وہ جو ایک مخصوص مقام تھا صرف ایک ہی قائم لِاَمرِاللہ کے حصہ میں آیا۔ یعنی سید المجددین امام المصلحین حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ۔ اپنے اپنے رنگ میں سب صاحبِ مراتب و مقامات تھے لیکن اس مرتبہ میں تو اور کسی کا ساجھا نہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قیامِ سنت و دینِ خالص کا قیامت تک کے لئے فیصلہ ہونے والا تھا اور مامون و معتصم کے جبرو قہر اور بشیر مریسی اور قاضی ابن ابی داؤد جیسے جابرہ معتزلہ کے تسلط و حکومت نے علماء حق کے لئے صرف دو ہی راستے باز رکھے تھے۔ یا اصحاب بدعت کے آگے سر جھکا دیں اور مسئلہ خلقِ قرآن پر ایمان لا کر ہمیشہ کے لئے اس کی نظیر قائم کر دیں کہ شریعت میں صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ جو رسول بتلا گیا بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا اور کیا جا سکتا ہے اور ہر ظن کو اس میں دخل ہے، ہر رائے اس پر قاضی و آمر ہے، ہر فلسفہ اس کا مالک و حاکم ہے اور یا پھر قید خانہ میں رہنا، ہر روز کوڑوں سے پیٹا جانا۔ بہتوں کے قدم تو ابتدا ہی میں لڑکھڑا گئے۔ بعضوں نے ابتدا میں استقامت دکھلائی لیکن پھر ضعف و رخصت کے گوشے میں پناہ گیر ہو گئے۔ بعضوں نے روپوشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی کہ کم سے کم اپنا دامن تو بچا جائیں۔ کوئی تو اس وقت یہ کہتا تھا کہ یہ زمانہ درس

واشاعتِ علوم و سنت کا نہیں ہے' یہ تو وہ زمانہ ہے کہ بس اللہ کے آگے تضرع و زاری کرو اور ایسی دعائیں مانگو جیسے سمندر میں ڈوبتا ہوا شخص دعا مانگے۔ کوئی کہتا تھا اپنی زبانوں کی نگہبانی کرو' اپنے دل کے علاج میں لگ جاؤ' جو جانتے ہو اس پر عمل کئے جاؤ اور جو برا ہو اس کو چھوڑ دو۔ کوئی کہتا کہ یہ زمانہ خاموشی کا زمانہ ہے اور اپنے اپنے دروازوں کو بند کر کے بیٹھ رہنے کا[1] جبکہ تمام اصحابِ کار و طریق کا یہ حال ہو رہا تھا اور دین خالص کا بقاء و قیام ایک عظیم الشان قربانی کا طلب گار تھا' تو غور کرو کہ صرف امام موصوف ہی تھے جن کو فاتح و سلطانِ عہد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے نہ تو داعیانِ فتنہ و بدعت کے آگے سر جھکایا نہ روپوشی و خاموشی و کنارہ کشی اختیار کی اور نہ بند حجروں کے اندر کی دعاؤں اور مناجاتوں پر قناعت کرلی بلکہ دینِ خالص کے قیام کی راہ میں اپنے نفسِ وجود کو قربان کردینے اور آنے والی امت کے لئے ثبات و استقامت علی السنہ کی راہ کھول دینے کے لئے بحکم خداوندی فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کو قید کیا گیا اور چار چار بوجھل بیڑیاں پاؤں میں ڈالیں گئیں ' بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھائے گئے اور اس پیٹھ پر جو علوم و معارف نبوت کی حامل تھی لگا تار کوڑے اس طرح مارے گئے کہ ہر جلّاد دو ضربیں پوری قوت سے لگا کر پیچھے ہٹ جاتا اور پھر نیا تازہ دم جلّاد اس کی جگہ لیتا۔ اس کو بھی خوشی خوشی برداشت کرلیا مگر اللہ کے عشق سے منہ نہ موڑا اور راہِ سنت سے منحرف نہ ہوئے۔ تازیانے کی ہر ضرب پر بھی جو صدا زبان سے نکلتی تھی وہ نہ تو جزع و فزع کی تھی اور نہ شور وفغاں کی بلکہ وہی تھی جس لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا یعنی اَلْقُرْاٰنُ كَلَامُ اللّٰهِ غَيْرُ مَخْلُوْقٍ خود خلیفہ المعتصم باللہ جس کی ہیبت و رعب سے قیصرِ روم لرزاں و ترساں رہتا تھا سر پر کھڑا تھا' جلادوں کا مجمع چاروں طرف سے

---

[1] یہ باتیں بھی اپنے مقام و رنگ میں ٹھیک تھیں اور ہرگز ہرگز موجب قدح نہیں۔ ارباب رخصت کے لئے اسی میں امن و سلامتی ہے۔ یہ مقام بھی ان لوگوں پر بدر جہا فضیلت رکھتا ہے جو خود اپنے اعتقاد و عمل کی بھی محافظت نہ کرسکے۔ لیکن ارباب عزیمت کا مقام دوسرا ہے ارباب رخصت کی نہایت ان کے لئے ہدایت کا حکم رکھتی ہے اور حَسَنَاتُ الاَبرارِ سَیِّئاتُ المقربین (نیکوکاروں کی نیکیاں مقربین کے لئے برائیاں بن جاتی ہیں) کے معاملات سب کے لئے یکساں نہیں ہوسکتے۔

ٹھیرے ہوئے تھا اور وہ بار بار کہہ رہا تھا یا احمد وَاللّٰہِ انّی علیک لشفیقٌ و انّی لاَشفقُ علیک کشفقتی علٰی ابنی واللّٰہ لئن اجابنی لاطلقنّ عنک بیدی یعنی واللہ میں تم پر اس سے زیادہ شفقت رکھتا ہوں جس قدر اپنے بیٹے کے لئے شفیق ہوں' اگر تم خلقِ قرآن کا اقرار کرلو[1] تو قسم خدا کی ابھی اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول دوں' لیکن اس پیکرِ حق اور مجسمۂ سنت کی زبان سے صرف یہی جواب نکلتا تھا اَعطُونی شیئًا مِن کتاب اللّٰہ اَو سُنّۃِ رَسولہٖ حتّٰی اَقول بہٖ (اللہ کی کتاب سے کچھ دکھلا دو یا اس کے رسول کا کوئی قول پیش کردو تو میں اقرار کرلوں' اس کے سوا میں اور کچھ نہیں جانتا۔)

جب معتصم ہر طرح عاجز آکر قاضی ابن ابی داوٗد وغیرہ علماء بدعت و اعتزال سے کہتا "نَاظِرُوہُ وَ کَلِّمُوہُ" اور وہ کتاب و سنت کے میدان میں عاجز آکر اپنے اوہام و ظنونِ باطلہ کو باسم عقل و رائے پیش کرتے کہ سراسر یونانیاتِ ملعونہ سے ماخوذ تھے تو امامؒ اس کے جواب میں بے ساختہ بول اٹھتے "مَا اَدری ماھٰذا" میں نہیں جانتا یہ کیا بلا ہے۔ اس تمام کائناتِ ہستی میں میرے سر کو جھکانے والی صرف دو ہی چیزیں ہیں ـ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت' اس کے سوا میرے لئے کوئی دلیل ہے نہ علم!

یہ جو میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ عزیمتِ دعوت 'عزیمتِ دعوت' تو یہ ہے عزیمتِ دعوت اور یہ ہے وراثت و نیابت مقامِ فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ کی' جس کی نسبت ترمذی کی روایت ہے: اَلصّبرُ فیھنّ کَالقبضِ علَی الجمر تو یہ وہی لوگ ہیں جو اگر چاہیں تو گزشتہ رخصت و بیچارگی میں امن و عافیت کے پھول چن سکتے ہیں لیکن وہ پھولوں کو چھوڑ کر دہکتے ہوئے انگارے پکڑ لیتے ہیں۔

حضرت امام موصوف کو عین حالتِ صوم میں کہ صرف پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھ لیا تھا' تو تازہ دم جلادوں نے پوری قوت سے کوڑے مارے یہاں تک کہ تمام پیٹھ زخموں سے چور ہوگئی اور تمام جسم خون سے رنگین ہوگیا۔ خود کہتے ہیں کہ جب ہوش آیا تو چند آدمی پانی لائے اور کہا پی لو' مگر میں نے انکار کردیا کہ روزہ نہیں توڑ سکتا۔ وہاں سے

---

[1] خلقِ قرآن کی تاریخ اور اس پر تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو "مسئلہ خلق قرآن" از مولانا ابوالکلام آزاد مطبوعہ شیخ اکیڈمی مل روڈ لاہور (م-ع)

مجھ کو اسحاق بن ابراہیم کے مکان میں لے گئے۔ ظہر کی نماز کا وقت آگیا تھا۔ ابن سماعہ نے امامت کی اور میں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ابن سماعہ نے کہا تم نے نماز پڑھی حالانکہ خون تمہارے کپڑوں میں بہہ رہا ہے یعنی دم جاری و کثیر کے بعد طہارت کہاں رہی؟ میں نے جواب دیا ہاں میں نے وہی کیا جو حضرت عمرؓ نے کیا تھا، صبح کی نماز پڑھا رہے تھے اور قاتل نے زخمی کیا مگر اسی حالت میں نماز پوری کی۔

ابن سماعہ کے جواب میں حضرت امامؒ نے حضرت عمرؓ کی جو نظیر پیش کی تو یہ ان کی تشفی کے لئے بس کرتی تھی، مگر میں کہتا ہوں کہ جو خون اُس وقت امام احمد بن حنبلؒ کے زخموں سے بہہ رہا تھا، اگر وہ خون ناپاک تھا اور اس کے ساتھ نماز نہیں ہوسکتی تو پھر دنیا میں اور کونسی چیز ایسی ہے جو انسان کو پاک کرسکتی ہے اور کونسا پانی ہے جو طاہر و مطہر ہوسکتا ہے۔ اگر یہ ناپاک ہے تو تمام دنیا کی پاکیاں اس ناپاکی پر قربان اور دنیا کی ساری طہارتیں اس پر سے نچھاور۔ یہ کیا بات ہے کہ پاک سے پاک اور مقدس سے مقدس انسان کی میت کے لئے بھی غسل ضروری ٹھہرا مگر شہیدانِ حق کے لئے یہ بات ہوئی کہ ان کی پاکی شرمندۂ آبِ غسل نہیں!

اللہ اللہ! یہاں طہارتِ جسم و لباس کا کیا سوال ہے۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی تمام عمر میں اگر کوئی پاک سے پاک اور سچی سے سچی نماز پڑھی تھی تو یقیناً وہ وہی ظہر کی نماز تھی۔ ان کی تمام عمر کی وہ نمازیں ایک طرف جو دجلہ کے پانی سے پاک کی گئیں تھی اور وہ چند گھڑیوں کی عبادت ایک طرف جس کو راہِ ثباتِ حق میں بہنے والے خون نے مقدس کردیا تھا!

فی الحقیقت حضرت امام موصوف کی نسبتِ محمدی اور کمالِ مرتبۂ تاسّی[1] بِاُسوۂ نبوّت کی یہی وہ شان و جلالت ہے جس نے ان کو تمام ائمہ و مجددینِ امت کی صفوفِ مراتبِ کمال سے بلند کرکے ایک دوسرے ہی مقام پر پہنچا دیا ہے۔ حتیٰ کہ تمام ائمہ اسلام میں یہ فضلِ مخصوص صرف انہی کے حصہ میں آیا کہ ان کی محبت و پیروی اہلِ حق و سنت ہونے کی دلیل ٹھہری اور ان سے انحراف بدعتی ہونے کی سب سے بڑی پہچان! جو اس امام کے قدم بقدم چلا اس نے سنت کو پایا اور جس نے اس کی راہ چھوڑی اس نے سنتِ رسول و

[1] اطاعت۔ تقلید (م۔ع)

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

رفقاء کی ذمہ داریاں

—— از قلم: نجیب صدیقی ——

جب ہم لفظ "رفقاء" ادا کرتے ہیں تو اس سے مراد ہم مقصد رفقاء ہوتے ہیں' وہ رفقاء جنہوں نے باہم کسی نصب العین کے حصول کا عہد کیا ہوا ہے اور جن کی سوچ ایک ہے۔ آدمی کی جان پہچان ' میل ملاقات اور دوستی بہت سوں سے ہوتی ہے' کوئی دفتر کا ساتھی ہے 'کوئی کاروباری رفیق ہے' کوئی محلے میں رہتا ہے تو اس طرح اس سے اچھی واقفیت ہے' عزیز و رشتہ دار ہیں' برادری کے ساتھی ہیں ' اپنے ہم زبان و ہم عمر افراد سے ملنا جلنا ہے ' غرض اسطرح کے بہت سے افراد سے ہم سب کا کسی نہ کسی نوعیت کا تعلق ہوتا ہے۔ انسان ویسے بھی معاشرتی حیوان ہے' مل جل کر رہنا اس کی عادت ہے چنانچہ رشتے ہیں' برادریاں ہیں 'ایک دوسرے کی ایک دوسرے سے ضروریات ہیں' آپس کا لین دین ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہم مقصد افراد کے باہمی رشتے ان سب سے بلند ہیں۔

دنیا میں رہنے کے لئے چھوٹے چھوٹے بہت سے مقاصد ہیں جن کا مشترکہ حصول آدمی کو ایک جگہ لا کھڑا کرتا ہے۔ بعض اوقات قدر مشترک کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے تعاون کرتا ہے۔ تاہم میں جن رفقاء کی بات کر رہا ہوں اور جن ہم مقصد ساتھیوں سے مخاطب ہوں' اگرچہ وہ زبان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اجنبی ہوں' رنگ و نسل کے اعتبار سے جدا ہوں' قومیت کے اعتبار سے الگ الگ ہوں' تعلیم کے اعتبار سے ان میں تفاوت ہو' معیارِ زندگی کے معاملے میں چھوٹے بڑے نظر آتے ہوں' مگر مقصد کے اعتبار سے وہ ایک "اکائی" اور نظریات کے اعتبار سے ایک وحدت ہیں۔ ان کی سوچ کی راہیں ایک ہیں' سب کی نگاہ کا ہدف صرف ایک ہے۔ ان سب کو جوڑنے والی چیز قرآن کے یہ الفاظ ہیں: **رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ** یعنی آپس میں نرم خو ہیں۔

اس کی بہترین مثال ہمیں قرنِ اول میں نظر آتی ہے کہ کہاں قریش کے منفرد لوگ '

کہاں مدینہ کے کسان' کہاں حبش کے غلام بلال' کہاں روم کے صہیب اور فارس کے سلمان' سب ایک دوسرے سے شیرو شکر ہیں۔ ان کو باہم کس چیز نے جوڑا تھا؟ وہ ایک اعلیٰ و ارفع مقصد تھا' جس کے حصول کی جدوجہد نے انہیں بنیانِ مرصوص بنا کر ایک صف میں کھڑا کر دیا تھا۔ آج اگر ہم اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں تو اگرچہ بحمد اللہ معاشرے کی عظیم اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے' جو ایک خدا' ایک رسول اور ایک دین کے ماننے والے ہیں' مساجد بھی کچھ نہ کچھ آباد ہیں' روزہ و نماز کا بھی کسی حد تک چرچا ہے' حج و زیارتوں کا شوق بھی ہے' خود مسلمان ہونے اور اپنے کو مسلمان کہلانے پر فخر بھی ہے' لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان سب کا ہدف دین کی سربلندی ہے؟ ہمارا معاشرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ خالص دنیا دار معاشرہ ہے' یہ دین کا نام ضرور لیتا ہے مگر عملاً اس نے دنیا اور حصولِ دنیا کو اپنا ہدف بنایا ہوا ہے اور دنیا کی لذات سے مستفید ہونے کیلئے حلال و حرام کے حدود کو کبھی کا پھلانگ چکا ہے۔ دین کی سربلندی اگر ان کا ہدف ہوتا تو پینتالیس برس میں اس کے کچھ آثار تو ظاہر ہوتے۔

آج کی گفتگو میں براہِ راست میرا یہ موضوع نہیں ہے کہ ہم نے تقسیم کے بعد ان پینتالیس برسوں میں دین کے لئے کتنا کام کیا ہے۔ جنہوں نے ان پینتالیس برسوں کا مطالعہ کیا ہے ان کی رائے تو یہ ہے کہ ہم نے الٹی زقند لگائی ہے۔ آج کا اصل موضوع تو رفقاء کی ذمہ داریوں سے متعلق ہے۔ ان اشارات سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ بیماری جب وبا کی شکل اختیار کر جاتی ہے تو علاج کرنے والوں کی ذمہ داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں اور وہ اپنا آرام و سکون تج دیتے ہیں اور لوگوں کی جانیں بچانے کیلئے اپنی جان داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ یہی حال ہمارے رفقاء کا ہونا چاہئے۔ معاشرہ جس تیزی کے ساتھ انحطاط پذیر ہے اسی قدر تیزی اور سرعت سے ہمیں اسے سنبھالنے کی کوشش کرنی چاہئے' خواہ اس میں ہماری ساری توانائیاں کیوں نہ صرف ہو جائیں۔

میرے ماں باپ قربان اس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جس نے یہ فرمایا کہ تم لوگ آگ کے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے ہو اور اس میں گرا چاہتے ہو' میں تمہارا ہاتھ پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں اور تمہیں اس میں گرنے سے بچا رہا ہوں۔ نبیؐ کی زندگی یقیناً ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ جو لوگ نبیؐ کے رستے پر چلنے کا نام لیتے ہیں ان کو چاہئے کہ خود بھی

اس آگ کے گڑھے میں گرنے سے بچیں اور نوعِ انسانی کو حتی المقدور اس میں گرنے سے بچائیں۔ چنانچہ ہم مقصد رفقاء کوباہم جوڑنے والی چیز واضح نصب العین ہے، جس کا ہمیں شعور ہونا چاہئے اور اس پر ایمان اتنا پختہ ہونا چاہئے کہ مخالف اثرات کے طوفان بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں، چہ جائیکہ معمولی بات پر ذہن بھٹکنے لگے۔ یہ شعور جتنا پختہ ہوگا وابستگی بھی اتنی ہی مضبوط ہوگی۔

نصب العین کے واضح شعور کے بعد دوسری چیز طریقِ کار پر دل ودماغ کا اطمینان ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایک ہی نصب العین کے حصول کے لئے بہت سے راستے ہیں۔ جب تک ان سب راستوں کے نشیب و فراز سے واقفیت اور ذہنی طور پر ان پر عدمِ اطمینان نہ ہوگا اور اپنے راستے اور طریقِ کار کا شعور اور ذہنی طور پر اس کی فوقیت مسلّم نہ ہوگی آدمی کے قدم آگے نہ بڑھ سکیں گے اور وہ ریب و تشکیک میں مبتلا رہے گا۔ اس طرح کے اذہان شیطان کے پہلے شکار ہوتے ہیں اور انہیں راہ سے بھٹکانے کیلئے اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اچھی طرح آگاہ ہونا چاہئے کہ اور جو بھی راستے ہیں ان میں کجی کہاں کہاں ہے اور ہمارا راستہ ان سب میں ممتاز کیوں ہے! جب تک ایسا نہ ہوگا سوچ میں یکسانیت پیدا نہ ہوگی۔ اس کی واحد کسوٹی انبیاء کا طریقِ کار ہے، خصوصاً ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس راستے پر چل کر اس کے سنگ ہائے میل نصب کئے ہیں ہمیں بھی زمان و مکان کے فاصلے کو مدنظر رکھتے ہوئے انہی سنگ ہائے میل کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اس کسوٹی پر جب ہم دوسرے راستوں کو پرکھتے ہیں تو ہمیں وہ کہیں نہ کہیں سے ہٹے نظر آتے ہیں۔ ان میں افراط و تفریط کے پیچ و خم پیدا ہو چکے ہیں اور ان راستوں پر چلنے والے بہت سی عصبیتوں کے شکار ہو چکے ہیں۔ وہ ایک سمت میں دوڑتے ہوئے ضرور نظر آئیں گے مگر ان کا حال قرآن مجید کے الفاظ میں "**تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى**" کا مصداق ہے۔ یعنی تم انہیں اکٹھے ضرور دیکھتے ہو مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ یہ دل ہی تو ہے جس سے دلجمعی پیدا ہوتی ہے، جس کے بغیر نصب العین کا حصول دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔

نصب العین کے شعور اور طریقِ کار پر دل و دماغ کے اطمینان کے بعد وہ جذبۂ محرکہ پیدا ہوتا ہے جو انسان کو آگے لیکر چلتا ہے۔ ایک انسان اگر چل تو رہا ہے مگر ڈھیلا چل

رہا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس کو یا تو نصب العین کا صحیح شعور نہیں یا طریقۂ کار پر دل کا بھرپور اطمینان نہیں۔ قرآن مجید نے اسے ایک مثال سے واضح کیا ہے کہ یہ منافق لوگ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسلمندی اور سستی کے ساتھ 'مارے باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ جی تو نہیں چاہتا مگر کھڑے ہیں اور جلد، سے جان چھڑانے کی فکر ذہن پر سوار رہتی ہے۔ انہیں اگر ایمان کی دولت میسر ہوتی' آخرت کا پختہ یقین ہوتا' جوابدہی کا شعور ہوتا' حشرونشر کی منزل آنکھوں کے سامنے ہوتی تو ان کی نماز مارے باندھے کی نماز ہرگز نہ ہوتی' بلکہ اس میں شوق و رغبت کی کیفیت ہوتی اور دل کی آمادگی نظر آتی' اور یہی نماز معراجِ مؤمن ہے۔ لیکن ایسی نماز جو کسلمندی کے ساتھ ادا کی جائے وہ اشارہ کر رہی ہے کہ اس نمازی کا تصورِ آخرت مضمحل ہے۔ اسی طرح جب آدمی کا نصب العین کے ساتھ گہرا شعور نہیں رہتا یا طریقِ کار پر دل کا جماؤ نہیں ہوتا تو وہ ہرگز آمادگی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ وہ چلے گا تو مارے باندھے چلے گا' جبکہ ایسا چلنا اور نہ چلنا دونوں برابر ہیں۔

اس اعتبار سے ہم سب کو اپنا مسلسل جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔ صرف یہی نہیں کہ ایک بار جائزہ لے کر مطمئن ہو جائیں اور کسی وقت ذرا سا خلا پا کر شیطان اپنا وار کر جائے جو ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ تنظیمی زندگی میں ہمارے سامنے بعض ایسی مثالیں بھی آتی ہیں کہ کوئی شخص نظم کی کسی خلاف ورزی پر امیر کی معمولی سی سرزنش بھی برداشت نہ کر سکا اور قافلے سے الگ ہو گیا۔ کارکنوں کی تربیت سامنے رکھتے ہوئے جب ہم اس معاملے کا جائزہ لیتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ذرا سی بات پر ایک شخص اپنے نصب العین ہی سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ اس کی اپنی "انا" کا قد گویا اتنا بلند ہے کہ نصب العین اس کے سامنے ہیچ ہو گیا۔ ایسا شخص کس منہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ بیان کر سکتا ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ حضورؐ کیسے کیسے طعنے سنتے تھے' لیکن پائے ثبات میں جنبش نہ آتی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں تربیت کی کس قدر ضرورت ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ خاکساروں کے یہاں اپنے کارکنوں کی تربیت کا کیسا مضبوط نظام تھا۔ معمولی سزا ان کے یہاں کوڑوں کی تھی اور وہ بھی شہر کی جامع مسجد کے سامنے' جمعہ

کی نماز کے بعد، خود ان کا سالار ہی کیوں نہ ہو، کوتاہی پر وہ ایک معمولی آدمی سے کوڑے کھاتا تھا۔ پھر سکھ قوم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ بھارتی پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ کو گرنتھیوں نے کسی کوتاہی پر یہ سزا دی کہ وہ پندرہ دن تک گردوارہ میں جا کر عوام الناس کے جوتے صاف کرے۔ اس وزیرِ اعلیٰ نے ایسا ہی کیا، تب اس کا قصور معاف ہوا۔ وزیرِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اس کی ناک تو بہت زیادہ اونچی ہونی چاہئے تھی۔ ہم اس کی جگہ ہوتے تو شاید سکھ قوم ہی کو خیرباد کہہ دیتے، لیکن نیچی نہ ہونے دیتے۔ تزکیہ کا نام لینا اور اسکی تسبیح پڑھنی اور بات ہے اور اس عمل سے گذرنا دوسری بات ہے۔ ع جس کو ہو جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں!۔۔۔۔اس راہ کے مسافر کا پہلا قدم ہی اپنی انا سے دست برداری ہے۔ ایک عظیم مقصد کی خاطر جس کے لئے جان قربان کرنے کا عہد کیا جاتا ہے، انا کی قربانی تو معمولی بات ہے۔

رفقاء کی ذمہ داریوں میں سمع و طاعت کی جو اہمیت ہے اسے مستحضر رہنا چاہئے۔ بغیر سمع و طاعت کے کوئی نظام نہیں چل سکتا چہ جائیکہ یہ دینی نظام۔ یہ نظام تو سمع و طاعت کے تانے بانے میں بنا ہوا ہے۔ قرآن حکیم میں مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ رسول اگر کسی بات کا فیصلہ کر دے تو اسے قبول کرو، صرف قبول ہی نہ کرو بلکہ دل کے اندر اتار لو، ایسا نہ ہو کہ دل کے کسی کونے میں کسک محسوس کرو اور مبادا تمہارا ایمان ہی ضائع ہو جائے۔ کتنی سخت وعید ہے جو اللہ کی طرف سے دی جارہی ہے۔

امیر رسولؐ تو نہیں ہوتا، اسی لئے اسکی اطاعت کتاب و سنت سے مشروط ہے، جبکہ رسولؐ کی اطاعت مشروط نہیں، لیکن امیر رسولؐ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ رسولؐ کا حقیقی نائب خلیفہ ہوتا ہے۔ مگر جب خلافت کا نظام قائم نہ ہو تو اس نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد میں امیر ہی قائم مقام ہو گا، لہٰذا اس کی بالمعروف اطاعت لازم ہے۔ یعنی یہ اطاعت کتاب وسنت سے مشروط ہوگی۔ مگر اطاعت میں اگر دل کی آمادگی نہیں ہوگی تو وہ اطاعت بے معنی رہے گی، اگرچہ یہ نفس پر بہت شاق گزرتی ہے۔ شیطان بھی ایسے موقع پر طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے تاکہ اطاعت کے عمل کو مجروح کر سکے۔ ایسے وقت میں اس سے مقابلہ کرنا اور نفس کو آمادۂ عمل کر کے اطاعت کو خوشدلی کے سانچے میں ڈھال لینا ہی تزکیہ ہے۔ اس تزکیہ کے عمل کو ہر وقت ہر جہت میں جاری رہنا چاہئے۔

نصب العین کے شعور، طریقِ کار پر دل و دماغ کے اطمینان اور سمع و طاعت کے اہتمام کے بعد عہد کی پاسداری نہایت اہم چیز ہے۔ عہد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا کہ عہد کے متعلق پوچھا جائیگا۔ یوں تو ہر چھوٹے بڑے عہد کی پاسداری ہم پر فرض ہے، لیکن یہ عہد تو عظیم عہد ہے، زندگی کا سودا، اپنے وجود کو اس کام میں کھپانے کا عہد۔ جتنا عظیم کام ہو اتنی ہی عظیم ذمہ داری ہوتی ہے، لہٰذا ہمیں اپنے اس عہد کی نگرانی اور اس کو پورا کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ ایک عہد ہم نے اپنے رب سے عالمِ ارواح میں کیا تھا جسے عہدِ الست کہتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی کے الفاظ میں ۔

وہاں قَالُوْا بَلٰی، یاں بت پرستی
ذرا سوچو کہا تھا کیا، کیا کیا

ہمارا یہ عہد بھی عہدِ الست ہی کا پرتو ہے ۔ تکبیرِ رب اور اقامتِ دین کی جدوجہد کا عہد اور انبیائے کرام کے مقصدِ بعثت کی تکمیل میں اپنے جسم و جان کی توانائیاں لگانے کا عہد!

اب آخری بات جو ہماری ذمہ داریوں کے سلسلے میں سامنے آتی ہے وہ ہماری ترجیحات ہیں۔ ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ عملاً ہماری ترجیحات کیا ہیں ۔ جہاں تک ہمارے معاشرے کا تعلق ہے اس نے اپنی ترجیحات میں دنیا کو اولیت دی ہے۔ ہم نے بھی اگر یہی چلن اختیار کیا تو یہ ساری باتیں عبث، بیکار اور تضیعِ اوقات ہیں۔

یہ ایک ایسا پیمانہ ہے جس سے ہر شخص اپنے آپ کو ناپ سکتا ہے، یہ ترازو ہر شخص کے دل میں نصب ہے، وہ تول کر دیکھے کہ کیا اس نے ان مقاصد کو ترجیحات میں شامل کیا ہے یا وہ معاشرے کے چلن کے ساتھ چل رہا ہے اور دنیا ہی اس کی ترجیحِ اول ہے۔ دل کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے، البتہ انسان کی جدوجہد کے مظاہر سے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ اس کی ترجیحات کیا ہیں، اس کی سعی و جہد کس سمت میں ہے۔ یہی باتیں تعین کریں گی کہ اس نے کس کو کس پر ترجیح دی ہے ۔

میں اپنی اس گفتگو کو مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں:

"پھر اگر ہم نے اس جدوجہد میں بازی پالی تو فہوالمراد' اور اگر دوسری بات ہوئی تب بھی تمام راستوں میں ایک حق ہی کا راستہ ہے جس میں ناکامیابی کا کوئی سوال نہیں۔ اس میں اول قدم بھی منزل ہے اور آخری بھی۔ ناکامی کا اس کوچہ میں گزر ہی نہیں۔ اس کو مان لینے اور اس پر چلنے کا عزم راسخ کر لینے کی ضرورت ہے۔ پھر اگر تیز سواری مل گئی تو فبہا' یہ نہ سہی تو چھکڑے ملیں گے' انہی سے سفر ہوگا' یہ بھی نہیں تو دو پاؤں موجود ہیں ان سے چلیں گے ' پاؤں بھی نہ رہیں تو آنکھیں تو ہیں ان سے نشانِ منزل دیکھیں گے ' آنکھیں بھی اگر بے نور ہو جائیں تو دل کی آنکھ تو ہے جس کی بصارت کو کوئی سلب نہیں کر سکتا' بشرطیکہ ایمان موجود ہو۔" (دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار)

ڈاکٹر اسرار احمد کا نہایت اہم خطاب

جہاد بالقرآن

کتابی صورت میں دستیاب ہے

صفحات: ۵۶ سفید کاغذ، عمدہ طباعت، قیمت فی نسخہ ۱۲ روپے

ضرورت رشتہ

اعوان برادری کی ایم ایس سی میتھ لیکچرر' نیز بی اے عمر ۲۴ ـ ۲۵ سال لڑکیوں کیلئے شریف اور باعزت گھرانوں سے رشتے درکار ہیں۔ لڑکے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور برسرروزگار ہوں۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں۔

برائے رابطہ = ملک غلام مرتضٰی ایڈووکیٹ چیمبر ۵۵ تمیزالدین لاء چیمبرز ڈسٹرکٹ کورٹس فیصل آباد فون : ۴۳۱۰۲

ہم مغرب سے مقابلہ کرتے ہیں

....اور اُن ہی کی سرزمین پر !

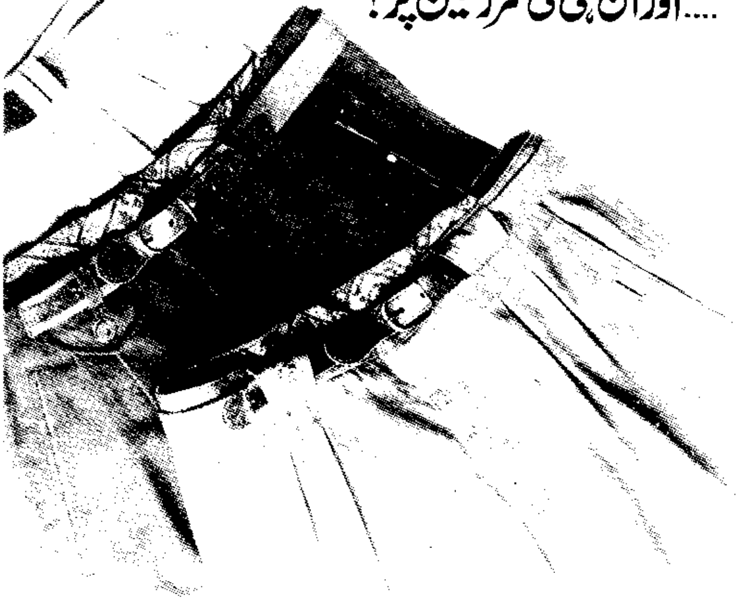

ہم اپنے گارمنٹس' بیڈلنن اور ٹیکسٹائل کی دیگر مصنوعات مغربی ممالک' اسکینڈی نیوین ممالک' شمالی امریکہ' روس اور مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں کو برآمد کرتے ہیں اور ہماری برآمدات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے لیکن بیرونی منڈیوں میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لئے ہمیں انتھک محنت کرکے اپنی فنی مہارت اور معلومات میں مستقل اضافہ کرتے رہنا پڑتا ہے۔ ایسی محنت جو ہمیں رُک کر دم نہیں لینے دیتی' ایسی محنت جو ہماری کارکردگی کے معیار کو اور بلند کرتی ہے' ایسی محنت جو کوالٹی' ڈیزائن اور پابندیٔ وقت کے سلسلے میں کرم فرماؤں کے مطالبات اطمینان بخش طریقے پر پورا کرنے کا ہمیں اہل بناتی ہے۔

Made in Pakistan
Registered Trade Mark

Jawad

جہاں شرط مہارت
وہاں جیت ہماری

معیاری گارمنٹس تیار کرنے اور برآمد کرنے والے

ایسوسی ایٹڈ انڈسٹریز (گارمنٹس) پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ

IV/C/3-A ناظم آباد کراچی - 18 - پاکستان - فون 610220-616018-628209

کیبل "JAWADSONS" ٹیلیکس 24555 JAWAD PK فیکس (92-21) 610522

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

REGD NO. L 7360
VOL.42 NO. 3
MARCH.1993